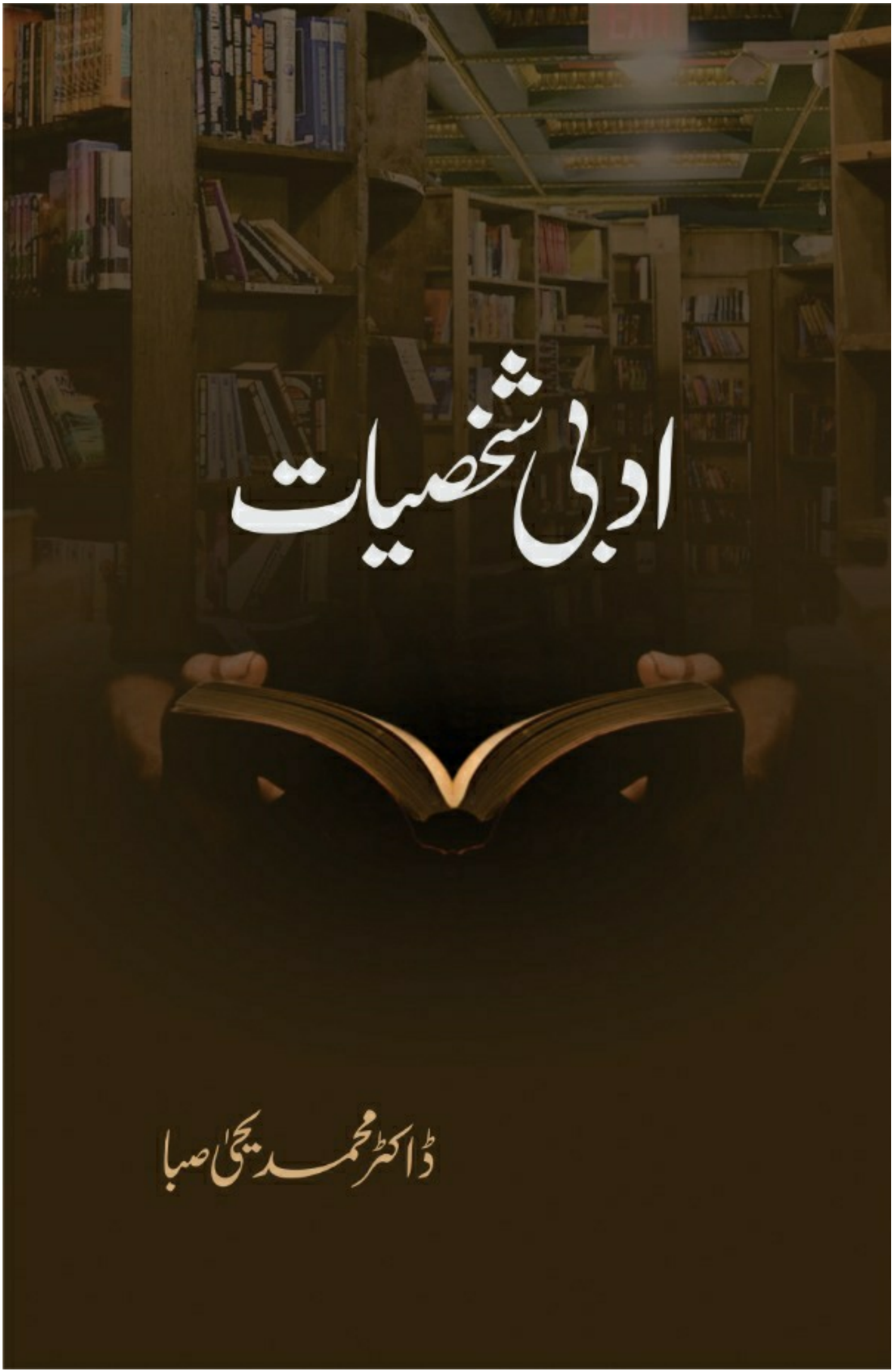

ادبی شخصیات

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

ادبی شخصیات

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

ادبی شخصیات

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

معاذ پبلیکیشنس
مالیگاؤں (ناسک)- 423203 (انڈیا)

© جملہ حقوق غزالہ شاہین محفوظ

نام کتاب : ادبی شخصیات
مصنف/ناشر : ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا
سنہ اشاعت : ۲۰۱۷
صفحات : ۱۴۰
قیمت : ۲۰۰
طباعت : معاذ پبلیکیشنس، مالیگاؤں (ناسک)-423203(انڈیا)

ADABI SHAKHSIYAAT

by:

Dr. Md. Yahya Saba

Year of Edition- 2013

ISBN: 978-81-930477-3-6

Price Rs. 200/-

Published By:

MAAZ PUBLICATIONS

H.No.117, S. No.170, Zaitoon Pura,
Malegaon Nasik, Maharashtra, India, 423203

انتساب

ان اساتذہ

کے نام

جو آج کے نامساعد حالات اور حوصلہ شکن تدریسی مسائل سے بددل نہیں ہیں بلکہ اپنے فراض منصبی کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی بقا اور اس کے فروغ کے لیے نہ صرف قابل قدر جذبہ رکھتے ہیں بلکہ کوشاں بھی ہیں۔

اور

ان طلبا کے

نام

جو ناسازگار سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کے باوجود اردو پڑھ رہے ہیں۔

فہرست

پیش لفظ	7
بہادر شاہ ظفر اور 1857	9
منٹو شناسی میں ایک اضافہ	21
ایک تبسم آفریں قلم کار خالد محمود	30
ہمارے عہد کا استعاراتی اظہار (ہاؤسنگ سوسائٹی)	36
آغا شاعر دہلوی اور ان کا عہد	42
آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری	74
جدید شاعری کے ترجمان: ناصر ملک	113
ناصر ملک کی شعر فہمی: 'ہتھیلی' کی روشنی میں	126
کتابیات	136

پیش لفظ

اردو زبان وادب کے مطالعے کے دوران یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ اس دشت کی سیاحی کے لیے ایک عمر نا کافی ہے اور میرے خیال میں کئی عمریں نا کافی ہیں۔قدم قدم پر حیرت زدہ نظارے دامن کو کھینچتے ہیں اور مجھ جیسے طالب علموں کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ ہنوز دہلی دور است۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے دوران کسی بھی طالب علم کی صاف وشفاف تعلیمی خدمت مقرر نہیں ہوتی کہ اسے آگے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے لیکن ایم اے تک آتے آتے کسی حد تک حدف کی نشاندہی ہو جاتی ہے لہٰذا مجھ جیسے لوگ اس وقت سنجیدگی سے ادب کو پڑھنا شروع کرتے ہیں۔اس میں وہ لوگ مستزاد ہیں جنھیں زبان وادب ورثے میں ملتی ہے۔

میں بھی ایسے ہی ایک قافلے کا طالب علم ہوں اور میں نے زبان وادب کو ایم اے اور اس بعد ہی سنجیدگی سے پڑھا ہے۔لیکن پتہ نہیں وہ کون سی ایسی بات تھی جس نے مجھے اوائل طالب علمی سے ہی ہر شئے کو غور سے دیکھنے پر مجبور کیا۔تجسس کے جذبے نے مجھے ادب کے کونے کھدروں میں جھانکنے سے ان کا مطالعہ کیا یہی تجسس کا جذبہ تھا جس کی بدولت میں نے ایم فل کیا اور بڑی عرق ریزی سے ان موضوعات کا انتخاب کیا اور دوران تحقیق میں نے دیکھا کہ ''کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے''۔

مضامین کا یہ انتخاب جو آپ کے زیر مطالعہ ہے ضرورت کہ تحت لکھے گئے مضامین قطعی نہیں یہ سارے مضامین خودرو پودے کی طرح برسوں سے میرے ذہن میں توجہ کے طلبگار رہے ہیں اور جب وہ صفحہ قرطاس پر آئے ہیں تو بھی میں نے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا اس انتخاب میں شامل مضامین قدیم لٹریچر کے ساتھ ساتھ جدید قلم کاروں بالخصوص نئی بستیوں کے فن کار نیز جدید تر ادبی

رجحانات وافکار کے روشنی میں قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری زبان کا دامن جتنا وسیع ہے اس کے تمام گوشوں پر نظر ڈالنے کی صلاحیت کسی ایک طالب علم میں نہیں ہوسکتی لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنا فرض مجھے پوری ایمانداری سے ادا کرنا ہے اور مضامین قلم بند کرتے وقت میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ مجھے قطعی یہ دعویٰ نہیں کہ میرے یہ مضامین اپنے موضوع کو پوری طرح واضح کر سکتے ہیں لیکن اگر میرے مضامین کے ذریعہ کسی اہم موضوع کی نشاندہی بھی ہوجائے تو میرے لیے یہ بات باعث تسکین ہوگی۔ تحقیق وتنقید کے فرش کی خاک روبی کرتے وقت میں نے خالی ادبی نظریات وعقائد نیز ان سے ابھرنے والے ادبی شہہ پاروں کا وسعت نظری سے مطالعہ کیا ہے اور ان خیالات سے اپنے ذہن ودل کو مالا مال بھی کیا ہے۔ استاد ان ادب کی صحبت میں بیٹھا ہوں اور ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کے دوران ان کے علمی کمالات سے اپنے دیدہ ودل کو تابناک ہوتے ہوئے محسوس بھی کیا ہے۔ ان مضامین میں اگر آپ کو کسی خوبی کی رمق نظر آئے تو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ کے فیض کا کرشمہ سمجھیں۔

جنھوں نے دوران طالب علمی ہمیشہ میری رہنمائی کی اور میری صلاحتوں کو صیقل کیا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میرے یہ منتخب مضامین اردو ادب کے ہجر لامتناہی میں بلبلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی پذیرائی میرے حوصلے میں اضافہ کردے اور میں تحقیق کے گہرے کنویں میں ڈول ڈالنے کی جرات کرسکوں، متن کے مطالعہ کے دوران اندرون متن موجود میرے جذبے اور معلوم ذرائع پر بھی نظر ڈالنا دیانت داری ہوگی کیونکہ اس مجموعہ میں موجود ایسے مضامین بھی ہیں جن کی توسیع کے لیے مجھے چند پیرگراف سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوئے یا کسی موضوع بالکل بھی کچھ ہاتھ نہیں آسکا۔ میرے قارئین میری اس مجبوری سے یقیناً وقف ہونگے اور ان کی ہمدردیاں مجھے حاصل ہونگی۔

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

بہادر شاہ ظفر اور 1857

شاعری خود ادب ہے اور ادب کا بڑا حصہ شاعری ہے شاعری کی تعریف مغرب تا مشرق خوب ہوئے لیکن کل ملا کر شاعری کا معاملہ آج بھی وہیں ہے کہ بقول شبلی:

''جو جذبات الفاظ کے ذریعہ ادا ہوں شعر ہے''

نہ جانے حضرت انسان کے سر میں یہ سودا کب سمایا کہ وہ اپنے دلی جذبات کو مشتہر کرے ضرورتاً بھی اور بغیر ضرورت کے بھی لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس امر نے دنیا میں آرٹ کی بنیاد ڈالی دی۔ یہ بات تو مسلّم ہے کہ اس روئے زمین پر کامیاب آرٹ کے جتنے بھی نادر نمونے ہیں وہ سب دلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں شاعری بھی آرٹ ہے اور اس میں بھی کامیاب شاعر وہی قرار پاتا ہے جو دلی جذبات کو بخوبی شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ ملٹن نے شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''شعر الفاظ کا ایسا استعمال ہے کہ اس سے تخیل دھوکہ کھا جائے۔ مصور رنگ کی مدد سے جو کام کرتا ہے اس کو الفاظ کے ذریعہ سرانجام دینے کی صنعت کا نام شاعری ہے''۔ یہ مغربی مفکر کا خیال ہے لیکن فارسی میں نظامی عروضی السمر قندی نے بھی شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ''شاعری ایسی صنعت ہے جس کی بدولت موہومات کی ترتیب سے چھوٹی چیز بڑی اور بڑی چیز چھوٹی کر کے دکھائی جاتی ہے اور اچھی چیز کو بدنما اور بری چیز کو خوش نما ثابت کیا جاتا ہے تا کہ انسان کے جذبات مشتعل ہوں اور طبیعت پر انبساط یا انقباض کی کیفیت طاری ہو اور یہ دنیا میں مہتمم بالشان کارناموں کا سبب بنے۔'' (چہار مقالہ باب شاعری)

اپنے جذبات کو مشتہر کرنے سے دوسروں کے جذبات مشتعل ہوں اور اگر یہ کام قصداً کیا جائے تو ایسی شاعری بھی مقصدیت کے زمرے میں داخل ہو جائے گی۔ یقیناً بہادر شاہ ظفر اسی زمرے میں شامل شاعر ہیں بھلے ہی ان کا تعلق کلاسکی عہد سے رہا ہو غزل اور بہادر شاہ ظفر کا ذکر آتے ہی اٹھارھویں اور انیسویں صدی پر محیط ادبی منظر نامے کا عکس ذہن کے پردے پر تھرکنے لگتا ہے بالخصوص اٹھارھویں صدی کا نصف آخری اور 19 ویں صدی کا نصف اول حصہ جو بہادر شاہ ظفر کا عہد بھی ہے (پیدائش 14 اکتوبر 1775 اور وفات 7 نومبر 1862) یہ دور نہ یہ کہ اردو شاعری کا ایک اہم دور ہے بلکہ یہ وہ عہد ہے جس میں سیاسی، سماجی، ثقافتی اور تہذیبی سطح پر جتنی تبدیلیاں ہندوستان میں ہوئیں شاید ہی کسی دور کو ایسا انقلابی رویہ میسر آیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ آرٹ زمانۂ سکون میں پروان چڑھتا ہے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اردو شاعری کے بامِ عروج پر پہنچنے کا عہد نہایت ہی جاں سوز عہد ہے۔ ایسا عہد جس میں ہر سطح پر تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ علمی میدان میں سائنس کا عمل دخل اسی عہد میں بڑھ رہا ہے ہندوستان گیر پیمانے پر انگریزوں کا تسلط اسی دور میں قائم ہوا وطنیت کا جذبہ اسی دور میں برگ و بار لایا غزل کے مقابلے میں موضوعاتی نظموں کو انگریزوں کے ایما پر اسی دور میں رواج دیا گیا، تجربے کے طور پر ہی سہی اودھ کے نواب کو اسی دور میں گرفتار کیا گیا، مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اسی عہد میں قید کر کے رنگون بھیجا گیا اور اسی عہد میں عام عوام میں ایک زبردست سیاسی تبدیلی یہ بھی دیکھنے میں آئی کہ ملک گیر پیمانے پر انگریزوں کے خلاف احتجاج کے شعلوں نے ایک مسلح جدوجہد کی شکل اختیار کر لی جسے انگریزوں نے 1857 کا غدر کہا۔ اور اس جدو جہد میں پہلی بار اور شاید آخری بار بھی تمام ہندوستانی صرف اور صرف ہندوستانی بن گئے اور اسی جدوجہد نے یہ طے کر دیا کہ انگریزوں کو جلد یا دیر میں ہندوستان سے واپس جانا ہوگا۔ تبدیلیوں کا یہ دور، جدو جہد کے یہ صبح و شام اور افراط و تفریط کے اس ماحول میں بہادر شاہ کی شاعری پروان چڑھی۔ بہادر شاہ ظفر نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو اسے چہار دانگ ہندوستان تک پھیلی ہوئی حکومت قلعے کی چہار دیواری تک سمٹی ہوتی نظر آئی اور قلعے میں بھی ان کی حکومت کیسی جب کہ وہ انگریزوں کے ذریعہ دیئے جانے

والے ایک لاکھ کے پنشن یافتہ تھے اور قلعے کے اندر بھی انگریزی ریزیڈنٹ کے احکام کو اولیت حاصل تھی۔لیکن ان سب باتوں کے باوجود بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے اور عوام کی ہمدردیاں اور محبتیں انھیں حاصل تھی۔ظاہر ہے یہ ایک بڑی طاقت تھی اور اسی کے بل پر وہ بادشاہ کہے جاتے رہے۔ بہادر شاہ ظفر کے دور کو یوں بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس دور میں تعلیم کا رشتہ سائنس سے جڑ گیا۔ پریس کی ایجاد ہوئی اور پہلی بار دہلی میں ایک ایسے کالج کی بنیاد پڑی جس میں جدید تعلیم کا انتظام کیا گیا۔اخبارات کا اجرا ہوا اور سائنسی ایجادات کا اثر براہ راست معاشرے پر پڑنے لگا تھا۔یہ ہی نہیں بلکہ اس دور میں ایک سے ایک صاحبِ فہم و ادراک شخصیات دہلی میں موجود تھیں جن کے افکار و خیالات آج بھی مستند سمجھے جاتے ہیں اور اس دور کے بعد ایسی نادر الوجود شخصیات بیک وقت دہلی میں پھر جمع نہ ہوسکیں۔سرسید نے لکھا ہے کہ:

> ''دہلی اہلِ کمال کا مرکز ہے ان اہلِ کمال میں اس دور کے اطبا بھی شامل ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ظفر کے زمانہ تک یہی صورتِ حال تھی اہلِ علم میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ ان کے برادران عزیز شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین شاہ اسماعیل شہید شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی جیسے اہل علم موجود تھے جن کی وجہ سے بعد میں علم حدیث ہندوستان بھر میں پھیلا اور محدث ہونا بہت بڑے مذہبی و علمی وقار کی بات سمجھی جاتی ہے۔''
>
> (آثار الصنادید، ص:518-517)

اس کے علاوہ مرزا غالب، مولوی امام بخش صہبائی، مومن خاں مومن، مولوی رشید الدین خاں، مولانا فضل حق خیرآبادی ان کے والد مولانا فضل امام خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ جو مرزا غالب کے خاص دوست تھے مولانا مملوک علی اس زمانہ کے دہلی کالج کے معروف اساتذہ میں سے تھے، ظفر کے استاد شیخ ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان اس کے

علاوہ ذوق کے پہلے ظفر اور ذوق دونوں کے استاد شاہ نصیر بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس دور میں دہلی با کمالوں کا منبع تھا اور ایک سے ایک نابغۂ روزگار اہل کمال کا تعلق براہِ راست بہادر شاہ ظفر سے رہا اور اسی ماحول میں ان کی شاعری نے وجود حاصل کیا۔

بہادر شاہ ظفر کا تعلق آرٹ سے براہِ راست رہا ہے۔ پروفیسر اسلم پرویز نے لکھا ہے کہ:

''ظفر کو فنونِ لطیفہ سے بے حد دلچسپی تھی چنانچہ موسیقی، خطاطی، مصوری، نقاشی اور شاعری ان تمام فنون میں ظفر گہری دلچسپی لیتے تھے اور خود بھی کئی خطّوں میں امتیاز رکھتے تھے۔''

(بہادر شاہ ظفر مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ڈاکٹر اسلم پرویز ص:374)

اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ظفر جس دور کی نمائندگی کرتے ہیں اسی دور کی نمائندگی شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن بھی کرتے ہیں لیکن ظفر کا معاملہ جن مراحل سے ہوتا ہے دوسرے ہمعصر شعرا کسی نہ کسی حد تک اس سے الگ ہیں ظفر بادشاہِ وقت بھی ہیں اور پنشن یافتہ بھی ان کے آباء واجداد نے جس مغلیہ حکومت کی بنیاد ڈالی تھی اور جس کا شہرہ پوری دنیا میں تھا اس مملکت کو وہ دیکھ رہے تھے لیکن اس پر اپنا حکم نہیں چلا سکتے تھے جس قلعہ معلیٰ میں ان کا مسکن تھا وہاں بھی وہ کسی نہ کسی حد کے پابند تھے، ان کے آباء واجداد نے جس دیوان عام، دیوان خاص یا رنگ محل میں جواہر لٹائے تھے آج وہاں وہ بنیوں سے قرض لینے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ وہ سارے حقائق ہیں جس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ظفر کو جو ذاتی تجربات ہوئے وہ اسی عہد کے دوسرے شعرا سے یکسر الگ اور ذاتی تھے اور یہی سبب ہے کہ ظفر کی شاعری کے اندرون میں کرب ایک لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے ایسا نہیں کہ اس کرب کی پرچھائیں غالب، نصیر یا مومن کی شاعری پر نہیں پڑ رہی ہے لیکن ظفر کا یہ سارا کرب ذاتی کرب بن کر ان کی شاعری میں توانائی کا جوہر بن گیا ہے ؎

گلشنِ دہر میں گلچینِ خزاں کا ہو برا
جس نے بوئے ہیں مرے حق میں سراسر کانٹے

ہم صفیر و مری فریاد و فغاں گلشن میں
آہ کیا ہوتا جو پاس آ کے قفس کے سنتے
گل کچھ تو اس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے
وہ کیا کریں کہ غنچہ بھی مرجھا کے جھڑ پڑے
کہوں بگولے کو کیا خاک میں بیاباں گرد
کہ میری طرح سے دیکھے کہاں نشیب و فراز
مجھے رونا تو یہ ہے مثلِ شبنم اے گلِ خنداں
کہ جب روتا ہوں تیرے روبرو تو اور ہنستا ہے
شمع جلتی ہے پر اس طرح کہاں جلتی ہے
ہڈی ہڈی مری اے سوزِ نہاں جلتی ہے

قفس، گلچیں، صیاد، گل، شمع، شبنم، فغاں، خزاں، چمن یہ سارے الفاظ ان چند اشعار میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور غور کریں تو ظفر کی پوری شاعری میں یہ الفاظ صرف لفظ بن کر نہیں رہ گئے بلکہ ہر لفظ کسی نہ کسی طویل داستان کا عنوان ہے اور اس لفظ کا سیاق اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ ظفر کے اندرون میں جو کرب کا طوفان پوشیدہ ہے یہ الفاظ اس کرب کی سفارت کر رہے ہیں اور ظاہر ہے وہ کرب اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ ظفر کی شاعری پر بات کرتے وقت اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کی سنگلاخ زمینوں کی سطح کو توڑنے میں پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں اور اس مشکل کام کو ظفر کی مشکل پسندی کا نام دے دیتے ہیں۔ ظفر کی مشکل پسندی تو اس دور سے مستعار ہے۔ ظفر سے ہم یہ توقع کیونکر کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے دور کے غالب رجحان مشکل پسندی سے باہر نکل کر ناصر کاظمی یا بانی جیسی شاعری کرنے لگتے ہیں۔ ظفر کے استاد شاہ نصیر اور ذوق ہیں اور اس دور میں جو شعرا ہیں وہ ہیں مرزا جان عیش، حافظ عبدالرحمٰن عیش، حافظ عبدالرحمٰن احسان، میر نظام الدین ممنون مومن خاں مومن اور خود غالب اور اس دور میں شاعری کا معیار طئے کیا جاتا ہے سنگلاخ زمین اور مشکل سے مشکل ردیفوں کو استعمال کرنے کے طریقہ سے ظاہر ہے بادشاہِ وقت اس رنگ سے اپنے آپ کو

الگ کیونکر کرتے جب کہ قلعہ معلّیٰ کا اندازِ بیان ہی نہیں وہاں کی نشست و برخاست وہاں کے لباس اور وہاں کی زبان عوام میں سندِ افتخار کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جو سرخیل ہیں دشمنانِ اردو غزل کے، روایت کے، اقدار کے اور خاص طور پر مغلیہ حکومت کے اور ہمدرد ہیں انگریزوں کے انھوں نے آبِ حیات میں ایک مقام پر اپنے والد کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اپنے دوست ذوق سے کہا کرتے تھے کہ: ''بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے خوب خوب طرحیں نکالتا ہے لیکن انھیں سرسبز نہیں کرسکتا اس کا کیا ہوا تم کرتے ہو'' (نوائے ظفر ص:7)

اس اقتباس سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ظفر بادشاہ ذوق کے ہیں محمد حسین آزاد کے والد انھیں اپنا بادشاہ نہیں سمجھتے اور دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ محمد حسین اازاد کو اس رنگ کی شاعری سے کہ ہے جو رنگ اس دور کا غالب رنگ ہے اس کی وضاحت ان کے اس اقتباس سے بخوبی ہو جاتی ہے جس میں انھوں نے مصحفی کے حوالے سے اپنی بات کہی ہے: ''الفاظ کو کم وبیش اور مضمون کو پس وپیش کر کے کچھ ایسا رکھ دیا ہے کہ جو حق استادی کا ہے وہ ادا ہو گیا ہے''

(آبِ حیات ص:67)

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ عہدِ ظفر میں شاعری کا رنگ مشکل پسندی سے موسوم تھا اور کامل استادانہ شان ہی یہ تھی کہ مشکل سے مشکل زمین میں دوراز کار مضامین کو باندھا جائے جس سے سامعین پر رعب پڑے اور ایسا ہی ہوتا تھا۔ لیکن اگر شعر میں احساس کی شدت کا ذکر کیا جائے جو اس دور میں بہت کم شعرا کے کلام میں تھی تو اس میں ظفر کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات اور احساس کی شدّت پورے شباب پر ہے اور وہ اسے بیان کرنے میں کبھی بھی پس و پیش نہیں کرتے بلکہ جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے چلے جاتے ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں

میرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

سوزِ غمِ فراق سے دل اس طرح جلا
پھر ہو سکا کسی سے نہ ٹھنڈا کسی طرح
ہم یہ تو نہیں کہتے کہ غم کہہ نہیں سکتے
پر جو شبِ غم ہے وہ ہم کہہ نہیں سکتے
آج تک معلوم یہ مجھکو نہیں کیا چیز ہوں
کون ہوں کیا شئے ہوں میں ناچیز ہوں یا چیز ہوں
اے ظفر کیا پوچھتے ہو کیا بتاؤں آپ کو
خاک ہوں میں خاک ہو ناکارہ ہوں ناچیز ہوں
لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کسی کی بنی ہے عالمِ نا پائدار میں

مندرجہ بالا اشعار میں غزل کا جو رنگ ہے یقیناً جدید ہے اور اپنے عہد کے عام رنگ سے ہٹ کر ہے حالانکہ سیاست اور معاشرے کی زبوں حالی کا ذکر کرنے کے لیے عہد ظفر میں ایک مایہ ناز صنف شہر آشوب موجود تھی اور اکثر شعرا اس صنف میں طبع آزمائی بھی کر رہے تھے لیکن ظفر نے اس صنف کو ہاتھ بھی نہ لگایا اور غزل کے اشعار میں ہی وہ تمام کرب وحزن یکجا کر دیے۔ شاعری کی تعریف کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے:

''شاعری ادب ہے جو عام طور سے انسان سے گہرا اور اعلیٰ علاقہ رکھتا ہے۔ انسانی دلچسپی کے جز کے علاوہ اس میں جمالی دلچسپی بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے کیونکہ ان لوگوں میں جن میں تفکر کا ذریعہ ایسی زبان ہے جس میں شعر لکھا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ جمالی حسن کے ایسے نفیس سانچے تیار ہو جاتے ہیں کہ خیالات کو حسن کارانہ رنگ عطا کر کے پڑھنے والوں کے قلوب کو متاثر کر سکتے ہیں۔''

(ایم.ایچ لڈل۔مقدمہ: سائنٹفک اسٹڈی آف پوئٹری)

ظفر کے یہاں جمالیاتی احساس کی فراوانی ہے حالانکہ وہ دور افراتفری کا ہے لیکن بادشاہ بہر حال بادشاہ ہے لہٰذا ان کی شاعری کا بڑا حصہ ان کے قلبی اور ذہنی واردات کا آئنہ ہے جس میں انھوں نے جسمانی اختلاط سے لے کر ذہنی آسودگی تک کے موضوعات کو شعری نزاکتوں کے ساتھ برت دیا ہے۔

جام ہے، شیشہ ہے، ساقی بھی ہے برسات بھی ہے
ان دنوں بادہ کشی دن بھی ہے اور رات بھی ہے
جوش مستی بھی ہے ہنگامِ ہم آغوشی بھی
خواہشِ وصل بھی ہے جائے ملاقات بھی ہے
وہ بھی سرمست ہے اور ہم بھی نشہ میں سرشار
ہاتھ گردن میں ہے اور لطف و عنایات بھی ہے
یار ہے یار کے ہے ساتھ ظفر بوس و کنار
اور اگر چاہیے کچھ بات تو وہ بات بھی ہے

جب انسان حالات کی چکّی میں بری طرح پس جاتا ہے اور ان حالات سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تو وہ ذہنی طور پر ہی سہی اس کیفیت یا اس جبر سے فرار کی کوشش کرتا ہے ایسے میں نفسانی جذبات اس کے کام آتی ہیں اور وہ نشے میں مدہوش ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے

بزرگوں نے تو یہ بھی کہا ہے کہ جب کوئی معاشرہ زوال پذیر ہوتا ہے تو وہاں شعر و شاعری نیز فنونِ لطیفہ تیزی سے پروان چڑھتا ہے۔ اگر اس رائے کی روشنی میں ہم عہد ظفر کو دیکھیں تو اس قول کی صداقت صد فی صد درست ثابت ہوتی ہے کہ جہاں عہد ظفر کے پہلے سے ہی مغلیہ حکومت نام کو رہ گئی تھی اور پوری ہندوستانی تہذیب انگریزوں کے زیر اثر آ چکی تھی ہر شعبۂ زندگی میں اضمحلال کی کیفیت تھی لیکن شاعری کے لیے بالخصوص اور اردو ادب کے لیے بالعموم یہ سنہرا دور تھا۔ اور ادبی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب نے اس دور میں جو نشانِ منزل

مقرر کیے آج بھی ہم اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ظفر کی شاعری میں منظر نگاری کا بھی حسنِ امتزاج ہے اور اس سلسلے میں بھی ان کے قوتِ متخیلہ کی داد دینی پڑتی ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں۔

''ایسے مواقع پر ظفر کی طبیعت طرفہ تماشائی بنی نظر آتی ہے اور یہاں بات تماشہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ظفر اس خوبصورت موقع پر اپنی طبیعت کی خوشیوں اور چہل بازیوں کا ذکر کرنے میں بھی تکلف نہیں کرتے۔اس طرح کے شعروں میں زندگی کی جو لہر آگے بڑھتی اور رگ رگ میں پھیلتی محسوس ہوتی ہے اس کی لفظی تصویر پیش کرنے میں ظفر کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہے اور اس کا یہ تعلق زندگی سے بہت قریب کا معلوم ہوتا ہے۔''

(ذوق سوانح اور انتقاد ص:42)

کنارِ آب ہو، مہتاب ہو، ساغر ہو، مینا ہو
جو یہ سامانِ کل ہوں پھر تو چہلیں ہوں، تماشہ ہو
ہم سے شرماؤ نہ تم چشم حیا کو کھولو
مثلِ گل شوق سے اب بندِ قبا کو کھولو
شمشیر برہنہ مانگ غضب آنکھوں کی چمک پھر ویسی ہے
جوڑے کی گندھاوٹ قہرِ خدا بالوں کی مہک پھر ویسی ہے
تادرِ جاناں ہمیں اول تو جانا منع ہے
اور گئے تو حلقۂ در کا ہلانا منع ہے
حلقۂ در گر ہلایا بھی تو بولے کون ہے
اب بتائیں کیا کہ نام اپنا بتانا منع ہے

غل مچا کر گر پکارا بھی تو جھنجھلا کر کہا
جاؤ کیوں آئے تمھیں گھر میں بلانا منع ہے

ظفر کے یہ اشعار ان کے ذاتی محسوسات سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن ذاتی محسوسات و تجربات کو شعر کا قالب عطا کرنا ان کا کمال ہے۔ ایسے مواقع پر ان کی شاعری میں لفظیات کی دنیا ایک خاص قسم کی بے ساختگی کو پروان چڑھاتی ہے اور یہی بے ساختگی ان کی شاعری کا حسن ہے۔ اس سلسلے میں عشرت جہاں ہاشمی رقم طراز ہیں:

''ظفر کی شاعری جن ذہنی امور اور حیاتِ گذراں کے جن کوائف کو پیش کرتے ہیں وہ ایک شہزادہ کی زندگی سے بہت قریب ہے۔ ٹھیک ہے کہ دوسروں کو بھی یہ مواقع ملتے ہیں لیکن عیشِ امروز کا یہ تصور اور آغوشِ انبساط سے لطف لینے کا یہ انداز، مسرور ہونے کی یہ خواہش اور کامیاب ہونے کی یہ خوشی سب کا حصّہ نہیں ہوسکتی۔ بالخصوص اس کا شاعرانہ بیان''

ظفر کے عہد میں تصوف کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور وہ خود بھی ''میاں کالے صاحب'' کے خاندان میں بیت تھے اور خود بھی دوسروں کو مرید کرتے تھے اسی لیے ان کو پیر و مرشد بھی کہا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کی شاعری میں غالب رنگ تصوف کا نہیں لیکن چیدہ چیدہ اشعار اس امر کی چغلی کھاتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کورے نہ تھے۔

میری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا
نہ وہ زمیں کے نہ ہے آسماں کے پردے میں
مگر ہے جلوہ نما دو جہاں کے پردے میں
دوئی کا پردہ اٹھا دل سے اور آنکھ سے دیکھ

خدا کے نور کو حسنِ بتاں کے پردے میں

ڈاکٹر اسلم پرویز نے ظفر کے سلسلے میں جو باتیں کی ہیں اس میں انھوں نے ظفر کے چار اہم رنگ کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

''اول وہ کلام جس میں محض فنّی مہارت بہم پہنچائی ہے اور قادرالکلامی کا مظاہرہ کیا ہے۔ دوم وہ کلام جس میں گیت نما غزلیں قوالیاں ٹھمریاں اور مخمس وغیرہ ہیں سوم وہ کلام ہے جس میں مذہبی اور تصوفانہ اشعار ملتے ہیں جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ذہن پر مذہب اور تصوف کا گہرا اثر ہے، چہارم وہ کلام جن میں ان کی انفرادیت نمایاں اور فن کاری کارفرما ہے۔''

اسلم پرویز کی رائے سے اختلاف کی گنجائش یوں بھی نہیں کہ انھوں نے ظفر پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے لیکن عام طور پر ظفر کی شاعری کا مخصوص رنگ ان کی شاعری میں موجود عشق و حسن کا تصور ہے جس کی جدیں معاملہ بندی سے جا ملتی ہیں لیکن مجھے بار بار یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ ساری معاملہ بندی ان کا وہ فرار ہے جو وہ اپنے مسائل سے کرتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ پھر اپنے ہوش میں آتے ہیں اور حقائق سے نظریں ملتی ہیں تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا
دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہا پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا
نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا
یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا

یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا
روشِ گل میں کہاں یار ہنسانے والے
ہم کو شبنم کی طرح سب ہیں رلانے والے

یہ وہ رنگ ہے جس میں عہدِ بہادر شاہ کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے اور 1857 کی پہلی جنگ آزادی جسے ناکام جنگ آزادی کہنا چاہیے کی ناکامی کا سارا کرب اس رنگ کے پس منظر میں صاف نظر آتا ہے۔

سرسید جس کے عینی شاہد ہیں۔موصوف نے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کیا تھا اور 1857 کے انقلاب کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔انہوں نے اسباب بغاوتِ ہند اور تاریخ سرکشی بجنور لکھ کر 1857ء کی تاریخ کو محفوظ کرلیا ہے۔تقریباً 80 ہزار دستاویزات آج بھی اردو اور فارسی میں 1857ء کے واقعات موجود ہیں جن تک رسائی ہمارے لیے لازمی ہے۔ اردو اور فارسی کے بغیر 1857ء کے انقلاب کو سمجھنا مشکل امر ہے۔ میرے یہ مضمون جہاں ادبی تاریخ کے محققین اور طلباء کے لیے نئے مواد کی فراہمی کا وسیلہ ہے وہیں ہندو پاک کی جدید تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ بھی۔ 1857ء کے انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہندو مسلم اتحاد تھا جو آج بھی اس ملک کی قومی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے یہ چند سطور اس ضرورت کی تکمیل میں سنگ میل کا حکم ثابت ہوگا۔

منٹوشناسی میں ایک اضافہ

کسی بھی ملک کی تاریخ تہذیب کے آئینے میں شناخت کی جاتی ہے اور دیکھا یہ جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی۔ کس حد تک اس میں اخذ وقبول کی صلاحیت تھی۔ اور اس میں کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی قوت تھی، ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں مختلف تہذیبی دھاروں نے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے۔ اور ہزار ہا برس کی اقوام عالم کی تاریخ اگر آج بھی زندہ ہے تو اس کی وجہ وہ تہذیبی دھارے ہیں جو ایک دوسرے سے اختلافات کے باوجود باہم ربطہ کے خصوصی جوہر اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ ہیں مگر سب رنگ مل کر ہندوستانی تہذیب کی بنیاد کا پتھر قرار پاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی جسم میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے بڑی چھوٹی ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔ سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہوتا ہے اور ان نکات کی نشاندہی کا سب سے موثر ذریعہ تصنیف وتالیف ہے۔ کتابیں تہذیب وثقافت کی امین ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ ماضی کے ورثہ کو مستقبل کے لوگوں تک پہنچا کر کامیابی کی راہیں متعین کی جاتی ہیں انسانی تاریخ کے ہر عہد میں کتابوں کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کی رشد و ہدایت کے لیے خدائے پاک نے انبیائے کرام پر چار آسمانی کتابیں نازل فرمائیں ان کتابوں کے نزول کو فرزندان آدم کے لیے نعمت اور ہدایت کا منبع ومرکز قرار دیا دنیا کی تاریخ میں پیغمبر ،صحابہ کرام اولیا وصوفیاء، شاعر وادیب اور ان جیسی ہستیاں گزریں ان سبھوں نے معاشرتی وانسانی نظام کی تشریح کتابوں کے ذریعہ ہی کی کیا۔

انسانی شعور کی بلندیوں نے ہر عہد اور ہر دور میں فکر کی شمعیں روشن کی ہیں۔علم وتہذیب کی آندھیوں کے بادمخالف کے تیز وتند جھونکے بھی ان چراغوں کی روشنی کو ماند نہ کر سکے۔ بلکہ اگر بغور دیکھا جائے تو ان مخالف حالات میں ان کی روشنی میں زور افزوں نکھار آیا ہے۔انہیں ضیا پاش چراغوں سے انسان کی ہر آنے والی نسل نے روشنی،عزم استقلال اور جدان حاصل کیا ہے۔صابر ادیب اپنے دور کی ایسی ہی ایک شمع ہیں جنہوں نے اپنی زندی خلق ادب کے لیے صرف کردی ہے اوراپنے ذاتی امور کو پس پشت ڈال کر خدمت اردو زبان وادب کو اپنا نصب العین بنایا ہے۔

یہ بات عام ہے کہ ادب اور بالخصوص نثری ادب کا تعلق سماج کے اس طبقے سے ہوتا ہے جس میں زندگی اپنے اصلی مفہوم میں فعال نظر آتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کے ذریعہ انسان اپنے خفتہ جذبات واحساسات کو بروئے کار لاتا ہے اور سماج پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔لیکن یہ بات بھی تجربہ میں آتی ہے کہ "نثر" اپنی زود حسی کی وجہ سے براہِ راست سماج کو متاثر کرنے والی صنف ہے۔اور صنفِ نثر میں افسانہ تیر بہ ہدف کا مقام حاصل کر چکا ہے۔بقول پروفیسر قمر رئیس کہ افسانہ پہلے عشق کا تیر ہے جو سینے کے پار ہوجاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس صنف نے ایک طویل عرصے تک اردو نثر پر حکومت کی ہے۔اور اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ابھی اس کی حکمرانی کا ہی دور ہے اور اردو فکشن آج بھی "افسانہ" کے بل پر ہی دیگر زبانوں کے مقابل کھڑی ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس قدر کم سِن صنف کو وہ کون سی جڑی پلا دی گئی یا کس فقیر نے اسے بقائے دوام کی دعا دے دی، جو اس کی خیر گی ختم ہونے میں نہیں آتی بلکہ روز بروز ترقی کے منازل طے کرتی جارہی ہے۔اس سوال کو حل کرنے کے لیے زیادہ نہیں بس چند لمحے غور کرنے کی ضرورت ہے۔اور وہ یہ کہ جس طرح اردو شاعری کو اگر اوائل عمری میں ہی ولؔی جیسا شاعر نصیب ہوگیا تھا اور بعد میں متواتر میرؔ و غالبؔ ملتے رہے تو یقیناً اردو افسانے کو بھی ولؔی کی طرح پریم چند ملے۔اور اس کے بعد کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی مل گئیں۔ اب میں تمہید کو یہیں ختم کر کے اپنے مطلب پر آتا ہوں کہ ان بڑے افسانہ نگاروں میں سب سے نمایاں نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔جن کی شخصیت اور فن پر کام کرنے والوں کی ایک طویل قطار

ہے۔لیکن پھر بھی ان کا فن آج بھی دعوتِ قلم زنی دیتا رہتا ہے۔منٹو ایک نابغہ تھا،منٹو بیّاضِ انسانیت تھا،منٹو دیوانگی کی حد تک انسانیت پرست تھا،منٹو قدروں کا پرستار تھا،منٹو درندگی سے بیزار تھا،منٹو کیا تھا؟منٹو کیسا تھا؟اس پر بہت ساری کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔لیکن اگر ان کتابوں کی افادیت کے لحاظ سے اگر کوئی فہرست بنائی جائے تو ایک نمایاں نام جو اُبھر کر آئے گا وہ نام ہوگا"فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا"اور یہ کاوش ہے شعبۂ اردو، کروڑی مل کالج کے سینئر استاد ڈاکٹر خالد اشرف کی، جنھوں نے منٹو نامے کی فہرست میں بڑی خاموشی سے اپنا نام رقم کروالیا۔لیکن ادب نواز جانتے ہیں کہ ان کا یہ کام منٹو پر کام کرنے والوں کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے پہلے کہ اس ہفتِ اقلیم کی سیر کی جائے مشہور ناقد اور ڈرامہ نویس پروفیسر محمد حسن کی رائے ملاحظہ کرلیں۔جو انھوں نے اس کتاب کے سلسلے میں پیش لفظ میں رقم کی ہیں:

''بڑی مسرت ہے کہ خالد اشرف نے اس طرف توجہ کی ہے اور کسی قدر معروضیت کے ساتھ اس میدان میں قدم یا قلم رکھا ہے۔گو اب بھی مجھے ان سے بہت سی اور توقعات ہیں۔ میں ان کی کاوش کا خیر مقدم کرتا ہوں اس توقع کے ساتھ ؎

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طئے

مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کاوش اردو فکشن کی تنقید کو نئی روش کی طرف رہنمائی کرے گی اور نئی آگاہیوں سے مالا مال کرے گی۔منٹو ایسے مقبول اور قدرِ متنازعہ فیہ فنکار کے تعینِ قدر کے سلسلے میں ہی نہیں دورِ حاضر میں ادبی تنقید کے منصب ومنہاج کے سلسلے میں بھی ان کی تصنیف فکر وتامل کے نئے باب کا اختتامیہ ثابت ہوگی۔خالد اشرف نے منٹو شناسی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے اور اس امتیاز کے لیے وہ دلی

مبارکباد کے مستحق ہیں''۔

مندرجہ بالا اقتباس میں نے محض ستائش کے لیے پیش نہیں کیے ہیں بلکہ اس اقتباس میں جس طرح پروفیسر محمد حسن نے ان امور کی وضاحت کی ہے وہ قابلِ غور ہے:

(الف) یہ کاوش اردو فکشن کی تنقید کو نئی روش کی طرف رہنمائی کرے گی اور نئی آگاہیوں سے مالا مال کرے گی۔

(ب) منٹو ایسے مقبول اور قدرے متنازعہ فیہ فنکار کے تعین قدر کے سلسلے میں رہنمائی کرے گی۔

(ج) دورِ حاضر میں ادبی تنقید کے منصب و منہاج کے سلسلے میں بھی اہم رول ادا کرے گی۔

(د) ان کی تصنیف فکر و تامل کے نئے باب کا اختتامیہ ثابت ہوگی۔

اور پھر اس اقتباس کے آخری حصے پر غور کریں۔

(ر) ڈاکٹر خالد اشرف نے منٹو شناسی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔

اب غور کریں تو اس ایک پیراگراف میں پانچ ایسے بڑے دعوے اس کتاب کے سلسلے میں پروفیسر محمد حسن نے یوں ہی نہیں کیے ہیں کیونکہ ہر ادب نواز پروفیسر محمد حسن کے مزاج اور ان کے کارناموں سے واقف ہیں۔ تو کیا سچ مچ ایسا ہے؟ آیئے ان دعوں کی دلیل ڈھونڈیں۔ اردو اکادمی دہلی سے انعام یافتہ یہ کتاب ڈمائی سائز میں 520 صفحات پر محیط ہے اور صفحہ نمبر 13 سے 131 تک کے مضمون کا عنوان ہے ''زندگی: ایک ٹیڑھی لکیر'' دوسرا مضمون ''تصانیف کا اجمالی جائزہ'' ہے جو صفحہ نمبر 132 سے صفحہ نمبر 154 تک پھیلا ہوا ہے۔ تیسرا مضمون ہے ''فن کے مختلف پہلو اور نظریہ'' جو صفحہ نمبر 155 سے صفحہ نمبر 210 پر محیط ہے اور پھر صفحہ نمبر 212 سے 510 تک ڈاکٹر خالد اشرف نے منٹو کے تیس مقبول افسانوں کا تجزیہ کیا ہے۔ اور آخر میں اشاریہ ہے۔ کتاب کا یہ اسٹرکچر جو بظاہر ایک علمی و تحقیقی مصنف کے تجربات کا غماض ہے لیکن سب سے بڑی بات جو اس کتاب میں نظر آتی ہے وہ ہے اس کا پسِ نوشت یا فٹ نوٹ جس پر موصوف نے جتنی عرق ریزی کی ہے وہ حاصل کتاب ہے۔ خاص طور پر ''زندگی: ایک ٹیڑھی لکیر'' کے فٹ نوٹس کو پڑھ کر یقیناً ایسا لگتا ہے کہ نوجوان ناقد نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر میں صفحہ نمبر 15 پر رقم صرف ایک

فٹ نوٹ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں، جوانھوں نے اس بات کی وضاحت کے لیے درج کیے ہیں کہ آیا منٹو کا مسلکِ دینی کیا تھا۔

''سعادت حسن دہلی میں نکلسن روڈ کشمیری گیٹ پر واقع حسن بلڈنگ کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ والد اور بھائیوں کے نام میں بھی حسن مشترک تھا۔ منٹو کی بیوی صفیہ کے چچا ملک حسن ممبئی میں جعفر ہاؤس میں قیام پذیر تھے۔ افسانہ ''آخری سیلوٹ'' کا صوبہ دار رب نواز لائسنس کا یکّہ بان ''ابو'' اور ''ننگی آوازیں'' ''کالو بھلو'' پنجتن پاک کی قسم کھاتے ہیں لیکن پروفیسر زماں آزردہ کے مطابق ''منٹو'' سنّی ہوتے ہیں اور سری نگر میں بھی موجود ہیں۔ نواب کاشمیری کے خاکے میں منٹو نے جو تحریر کیا ہے وہ نہایت خوبصورت ہے ''نواب بڑا طہارت پسند تھا، شیعہ تھا۔ کوئی کام بغیر استخارے کے نہیں کرتا تھا۔ سنّی اور شیعہ ہونے میں کیا فرق ہے؟ لیکن جب ان دو فرقوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تو اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ان کے دماغوں میں مذہبی فتور ہے۔''

جی ہاں یہ اقتباس اس فٹ نوٹ کا ہے جو انھوں نے ایک صفحے پر درج کیے ہیں۔ ایسے اور اس سے بڑے بڑے 128 فٹ نوٹس صرف ''زندگی: ایک ٹیڑھی لکیر'' کے مضمون سے منسلک ہیں۔ جو یقیناً پروفیسر محمد حسن کے دعوے کی دلیل ہیں۔ جہاں تک سوال ہے متنازعہ فیہ کا تو یہ بات اب اظہر من الشّمس ہے کہ سعادت حسن منٹو پر فحاشی کا الزام ناروا اور سراسر عصبیت پر مبنی تھا لیکن اس کے لیے ڈاکٹر خالد اشرف نے جس تحقیقی انداز سے بحث کی ہے اور مواد فراہم کیے ہیں۔ وہ اس لائق ہیں کہ اب اس الزام کی کوئی حقیقت نہیں۔ ڈاکٹر خالد اشرف ایک نہایت کھلے ذہن کے اسکالر ہیں، اپنے

کام کو وہ جس طرح ایک مشن سمجھ کر کرتے ہیں اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اردو کا مستقبل نہایت روشن ہے۔ ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ اس دنیا میں صداقت، خیر اور حسن کی باز آفرینی سے ہی اعلیٰ اقدار کی حصولیابی ممکن ہے اور غالباً انھوں نے منٹو کو اس پیمانے پر پوری طرح پرکھا ہے۔ ان کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی ڈاکٹر خالد اشرف نے اس بنیادی کلیے کو فراموش نہیں کیا ہے۔

منٹو کا ایک افسانہ ''سوراج کے لیے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا اشہبِ قلم یوں رواں ہوتا ہے:

> ''کیا غلام علی اور نگار کے جسمانی لذت حاصل نہ کرنے اور اولاد پیدا نہ کرنے کے فیصلے سے سامراجی قوتوں کو واقعی کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب نفی میں بھی ہو سکتا ہے اور اثبات میں بھی۔ یہ تو اظہر من الشمس ہے کہ غلام علی کے ایک غلام بچّہ پیدا کرنے یا نہ کرنے سے انگریزی سامراج فوری طور پر متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑی بڑی جابر قوتیں عوامی آدرشوں اور ارادوں کے سامنے ایک نہ ایک دن لڑکھڑا کر منہدم ہو ہی جاتی ہیں۔ ان ارادوں اور آدرشوں پر عمل کرنے کے لیے ایک انقلابی آگ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ آگ سب سے پہلے ان لوگوں کے سینے میں پیدا ہوتی ہے، جن کی شخصیت میں ہیرو ازم کے عناصر پہلے سے موجود ہوتے ہیں یہی ہیرو ہوتے ہیں جو بڑی سماجی تحریکات کی رہنمائی کرتے ہیں اور معاشرتی تبدیلیوں کے لیے زمین تیار کرتے ہیں۔''

آپ نے دیکھا کہ ڈاکٹر خالد اشرف نے تجزیہ نگاری کے فن کا حق کیسے ادا کیا۔ یہاں سیاست بھی ہے اور معاشرے کے موجود مسائل کا حل بھی، تشکیک بھی ہے، لیکن تشکیک محض تشکیک نہیں۔ اس کے جواب کے لیے ان کے پاس معقول جواز ہے اور اس طرح وہ منٹو کے اس قدر کی

وضاحت بھی کر دیتے ہیں، جس قدر کی چھوٹ ان کے تمام افسانوں پر برنگِ دیگر پڑ رہی ہے۔
ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ:

''زبان تحریری اور غیر تحریری علامات کا ایک ایسا روایتی نظام
ہے جس کے ذریعہ انسان ایک سماجی گروہ کے رکن اور اس
کے تہذیبی عمل میں شریک ہونے والے فرد کی حیثیت سے
اپنا اظہار کرتا ہے۔''

بزم ہستی میں رب کی قدرت کے مظاہر کا شمار نہیں۔ ہر صدی اور ہر زمانے میں ایسی ہستیاں ملتی ہیں جو انفرادی شان کے ساتھ اس کا درگاہ حیات میں جلوہ افروز ہوئی ہیں۔ ان میں کوئی ایسا امتیازی جوہر ہوتا ہے جو نمایاں نظر آتا ہے اور وہ اسی جوہر کے باعث اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ کچھ معتبر شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ادب کی دنیا میں تاریکی کی ردا اوڑھ کر وقت اور حالات کے پیش نظر ادبی کارنامے انجام دے کر منظر عام پر آنے سے گریز کرتی ہیں، ایسے لوگ نام کے نہیں کام کے ہوتے ہیں۔ بڑی شخصیات کی عظمت کا راز کسی ایک بات یا ایک پہلو میں پوشیدہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے اپنے افکار و خیالات، تجربات و مشاہدات اور اخلاق و عمل کے تمام نظام اوعوامل ایک دوسرے میں مل جل کر اسے اپنے وقت کے انسانوں سے بلند اور اور عظیم بننے میں مدد دیتے ہیں پھر بھی کسی شخصیت اور ذات کے دوروں خانہ کے محرم ہونے کے دعویٰ کا صحیح ہونا ایک حد تک ناممکن ہے۔ ہر دور جہاں ایک سمت اپنی ماضی کا امین ہوتا ہے وہاں دوسری سمت مستقبل کا نقیب بھی ہوتا ہے۔ ہر دور کا سماج قدیم روایات اور اقدار کو قبول کرتے ہوئے رفتہ رفتہ بدلتے ہوئے تقاضوں کی روشنی میں انہیں درست یا تبدیل کر رہتا ہے۔ اور اس طرح بتدریج نئے اداروں اور نئی قدروں کا جنم ہوتا ہے اکثر یہ تبدیلیاں اتنی آہستہ خرامی آتی ہیں کہ ان کا احساس دیر میں ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسے معاشی، ثقافتی، سیاسی، مذہبی یا اقتصادی حالات پیدا ہوتے ہیں کہ سماج ان سے بہت تیزی سے متاثر ہوتا ہے۔ اور ان اثرات کے تحت سماج میں اتنی واضح اور غیر معمولی تبدیلی ہوتی ہے کہ قلیل عرصہ میں ہی اس کا نمایاں احساس ہونے لگتا ہے۔ انسان کی تخلیقی صلاحیت اسے فکر کے آئینہ میں آنے والے

حالات کی تقدیر دکھاتی ہے۔لہٰذا ہمارا سماجی نظریہ بھی موجودہ سماج کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے بھی ان کا ناقد بھی ہوتا ہے کہ اپنے نقد ونظر کی بنا پر سماج کو بدلنے کا اہل بھی ثابت ہو سکے ۔ڈاکٹر خالد اشرف کا تعلق جس ادبی نسل سے ہے اس نے خود تو نہیں لیکن اپنے پیش روؤں کو ادبی دھول دھپّا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جدیدیت اور ترقی پسند ادب کی کشاکش کو تو خود خالد اشرف نے بھی دیکھا ہے لیکن اس کے بعد اور خاص طور پر سوویت روس کے منتشر ہونے کے بعد جو ایک خاموشی تحریکات پر طاری ہے اس سکون کے دور میں ڈاکٹر خالد اشرف کا ذہن پر سکون یا تعطل کا شکار نہیں ہوا اور وہ اس بات سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ زبان کی بقا کے لیے جس جدوجہد کی ضرورت ہے وہ ان کی نسل کو کرنی ہے لیکن افراد اور خاص طور پر ذہین افراد کے اس قحط الرجال میں انھوں نے اپنے حصّے کے کام کا انتخاب کر لیا۔ اور بڑی بالغ نظری سے انھوں نے نثر کو اپنا موضوع بنا لیا۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ اب شاعری کا وہ دور لوٹ کر آنے والا نہیں بلکہ یہ صدی بھی یقیناً نثر کی صدی ہی رہے گی اور اس نسل کو اگر نثری اسرار و رموز سے آگاہی نہ ہوئی تو یہ ایک بڑا خسارہ ثابت ہوگا۔ انھوں نے اپنے پیش روؤں کو محض چند جملے بازوں کے حوالے کر دیا تو پھر نیا افسانہ لکھنے کے لیے بنیاد کمزور ہو جائے گی۔ اس کے پیشِ نظر انھوں نے اس کے پہلے ''عزمی دہلوی کی شخصیت اور ناول نگاری'' ''برصغیر میں اردو ناول'' پر ایک جامع کتاب لکھی اور اب منٹو پر ان کا یہ شاہکار یقیناً دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایک بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ بھلے ہی بٹوارے کے خونچکاں واقعات کو قلمبند کرنے میں منٹو نے کمال کر دیا ہو لیکن جب وہ خود پاکستان جاتے ہیں تو وہاں وہ کوئی خاص کمال نہیں کر پاتے اور بری طرح ٹوٹ جاتے ہیں اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ انا پرست انسان یعنی منٹو پیٹ کی آگ بجھانے کی مشین کا ایک معمولی پرزہ بن جاتا ہے۔ بے تحاشہ لکھتا ہے لیکن وہ میر مدن والی بات نہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر خالد اشرف نے تحقیقی انداز میں منٹو کی کہانی کو اختتام تک پہنچایا ہے۔ ''فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا'' یقیناً ایک ایسی تحقیقی کتاب ہے، جس پر ڈھیر سارے علمی تحقیقی تنقیدی سوالات قائم کیے جا سکتے ہیں لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اب یہ سوالات قائم کون کرے کہ ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے'' بر طرف

سیاست کی گرم بازاری ہے اور یہ سیاست ادب میں مدغم ہو کر انصاف پسند مصنفین کا قلع قمع کر رہی ہے۔ کاش یہ کتاب اس زمانے میں شائع ہوتی جب قدر شناسی عنقا نہیں تھی۔ لیکن ''نہ ہو نومید'' کے مصداق اس بات پر بھروسہ قائم رہنا چاہیے کہ جب بھی کوئی ناقد یا محقق اب منٹو شناسی کی راہ میں قدم بڑھائے گا تو اس کتاب کے بغیر اس کا کام ادھورا رہے گا۔ خدا ڈاکٹر خالد اشرف کو نظرِ بد سے بچائے یقیناً مستقبل میں ابھی ان کے قلم اور دماغ میں بہت جان باقی ہے عین ممکن ہے کہ وہ دوسرے کسی ایسے ہی پروجیکٹ کا لائحہ عمل مرتب کر چکے ہوں۔

ایک تبسم آفریں قلم کار خالد محمود

انشائیہ کے تقریباً وہی مفہوم و معنی سمجھے جاتے ہیں جو انگریزی کے لفظ ''ESSAY'' سے مراد ہے۔ ناول اور افسانہ کی طرح ''انشائیہ'' بھی مغربی ادب کے اثر سے وجود میں آیا۔ ''انشائیہ'' کی بندھی ٹکی کوئی ایک مخصوص تعریف نہیں ہے انشائیہ ذہنی پرواز کی اپج خیالات کی بلندی اور ذاتی تاثرات کو فنی انداز میں پیش کرنے کا نام ہے، انشائیہ کا لکھنے والا اس کا خیال رکھتا ہے کہ اس میں علمیت یا افکار و مسائل کا بیان نہ صرف تخلیقی طور پر ہو بلکہ اس کی عبارت ادبی چاشنی شگفتگی، تاثر اور مزاح سے بھر پور ہوتا کہ قاری اس کو پڑھ کر ذہنی آسودگی کے ساتھ ساتھ قلبی مسرت بھی محسوس کرے۔ انشائیہ کے پرواز کا کمال یہ ہے کہ وہ آزاد خیالی کے ساتھ بات میں بات پیدا کرتا ہوا اپنے مضمون کو نئے نقط نظر اور نئی روشنی کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کرے۔ اردو ادب میں ''انشائیہ'' کا آغاز سرسید کے ان مضامین سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں لکھے۔ انشائیہ میں مذہبی، سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی غرض سب طرح کے مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ اردو انشائیہ کا مستقبل روشن ہے۔

اردو ادب میں فرحت اللہ بیگ حسن نظامی اور رشید احمد صدیقی کا نام خاکہ نگاری کے لیے بہت مشہور ہے۔ خاکہ انگریزی لفظ اسکیچ کا ہم معنی لفظ ہے۔ خاکہ ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں کسی شخصیت کی تصویر کشی لفظوں میں کی جاتی ہے جس شخص کا خاکہ لکھا جاتا ہے اس کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ خاکہ نگاری کا مقصد کسی شخص کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو اس

طرح بیان کرنا ہے کہ قاری اس سے اچھی طرح واقف ہو جائے۔ اور اس مخصوص شخصیت اور قاری کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو جائے۔ خاکہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ اسے اس شخصیت کا قرب حاصل ہو جس پر خاکہ لکھا جا رہا ہے تا کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو لکھنے والے کے سامنے ہو ایک اچھا خاکہ نگار کسی شخصیت کے اوصاف اس طرح بیان کرتا ہے کہ خوبیوں کا بیان کرتے ہوئے اس سے مرعوب نہیں ہوتا اور خامیاں بیان کرتے ہوئے ہر طرح کے تعصب سے آزاد رہتا ہے۔ اردو میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا مولوی نذیر احمد کی کہانی۔ ''کچھ میری کچھ ان کی زبانی'' اور عصمت چغتائی کا خاکہ ''دوزخی'' اردو کے کامیاب ترین خاکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ''گنج ہائے گراں مایہ'' میں رشید احمد صدیقی نے بعض اہم شخصیتوں کے نہایت دل کش خاکے لکھے ہیں اردو کے معروف خاکہ نگاروں میں مولوی عبدالحق، شاہد احمد دہلوی اور سعادت حسن منٹو کے نام بہت اہم ہیں۔ افسانہ اور رپورتاژ کی طرح خاکہ و انشائیہ نگاری بھی اردو میں دور جدید کی پیداوار ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف آب حیات میں اس کی عمدہ مثالیں مل جائیں گی ہر چند کے آب حیات میں اردو شعراء کا تذکرہ ہے، لیکن شعراء کرام کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد حسین آزاد نے ان کی شخصیتوں کے جو خاکے کھینچے ہیں وہ بے حد دلکش اور توجہ طلب ہیں۔ خاکہ اور انشائیہ نگاری کا کمال بھی یہی ہے کہ جس شخص کا خاکہ کھینچا جائے یا جس چیز پر انشائیہ لکھا جائے اس کی چلتی پھرتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، لیکن عمدہ اور معیاری خاکہ اور انشائیہ کی پہچان یہ ہے کہ اس میں شخصی خوبیاں اور خامیاں دونوں بیان کی جائیں۔ رشید احمد صدیقی کے بعد جدید دور میں بے شمار خاکے لکھے گئے مثلاً عصمت چغتائی، کرشن چندر، فکر تونسوی، مہندر ناتھ، سعادت حسن منٹو، سردار جعفری، باقر مہدی، پرکاش فکری، خالد محمود وغیرہ نے بے شمار خاکے و انشائیے لکھے ان خاکوں اور انشائیوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو میں خاکہ اور انشائیہ نگاری کی روایت بے حد شاندار معیاری اور مستحکم ہے۔ ''شگفتگی دل کی'' خالد محمود کے انشائیوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف کے ان انشائیوں اور خاکوں میں طنز و مزاح غالب ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین ہند اور بیرون ہند کے مؤقر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ انہیں زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل ہے

ان کی نظر گہری اور وسیع ہے وہ محاوروں کا صحیح استعمال جانتے ہیں اور ان سے لطف پیدا کرتے ہیں ۔اپنی تحریر کو بامعنی بنانے کے لیے الفاظ بھی معیاری استعمال کرتے ہیں ۔اس کتاب میں چونکہ زیادہ تر خاکے ایسی شخصیتوں پر ہیں جن سے وہ متاثر ہوئے یا رہے ہیں اس لیے انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ صاحب خاکہ کو اپنی ظرافت کی گل افشانیاں دکھانے کے لیے تختۂ مشق نہ بنائیں ۔اس لیے عام طور پر یہ خاکے بہت مودبانہ انداز میں لکھے گئے ہیں تاہم کہیں کہیں ظرافت کے ہلکے چھینٹے ضرور نظر آجاتے ہیں ۔ہر خاکے میں کچھ ایسا التزام کیا گیا ہے کہ ممدوح کی شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے آجائے ۔ان میں سے بعض خاکے میں تو ممدوح کی آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خالد محمود ایک کامیاب خاکہ نگار ہیں ۔اردو کے کلاسیکی ادب سے ان کی واقفیت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے وہ ایک ہی ساتھ محقق نقاد شاعر و ادیب ہیں ۔خالد محمود کی شگفتہ تحریروں کا قائل ہر وہ شخص ہے جس نے انھیں پڑھا ہے یا سنا ہے ۔وجیہ خدوخال کے مالک خالد محمود علمی و ادبی حلقوں میں مقبول بھی اسی لیے ہیں کہ وہ خود بھی نستعلیق ہیں اور ان کی تحریریں بھی میرے سامنے ان کی تحریروں کا یہ مجموعہ ''شگفتگی دل کی'' ہے جس پر کچھ لکھنے سے پہلے میں یہ صاف کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ زندہ تحریریں وہی ہوتی ہیں جو آنکھوں سے پڑھی جائیں لیکن ہر لفظ دل میں اتر جائے ۔خالد محمود اس کتاب کے حوالے سے ایک خوش اطوار، خوش اسلوب، خوش فکر اور خوشخصال قلم کار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرتے نظر آتے ہیں لیکن دوران خوش طبعی جب ان کا قلم سنجیدگی کی طرف مائل ہوتا ہے تو اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ پچھلے 20-30 سالوں میں ادب کا مفہوم ہی بدل گیا ہے اب کسی سنجیدہ ادب کا مطلب ہوتا ہے کسی مخصوص فکر کو مشتہر کرنا جو ادبی کم سیاسی زیادہ ہو لیکن خالد محمود کی سنجیدگی ذرا دوسرے قسم کی ہے ۔

> ''یوں دیکھا جائے تو صغریٰ آپا ساٹھ سال کی تو اسی دن ہوگئی تھیں جب ان کے مربی اور مشفق ماموں جان (عابد صاحب) اور ممانی جان (صالحہ آپا) انہیں چھوڑ کر چل

دیئے تھے۔ناز برداریاں کرنے والے نہ ہوں تو انسان فوراً
ساٹھ کا ہو جاتا ہے''
(''صغریٰ آپا وظیفہ یاب ہوگئیں''، صفحہ 33، ''شگفتگی دل کی''، خالد محمود)

صغریٰ مہدی کی ملازمت سے سبکدوشی کے موقع پر پڑھا گیا یہ مقالہ خالد محمود کی ان حسین تحریروں میں سے ایک ہے جس میں انہوں نے شگفتہ تحریروں کو وقار عطا کر دیا ہے لیکن پورے مضمون میں اندرونِ متن ایک کرب بھی موجود ہے کہ اب شعبوں سے صغریٰ مہدی جیسے کردار رفتہ رفتہ غائب ہوتے جا رہے ہیں جنھیں وہ اپنا کلیگ نہیں بلکہ بڑی بہن کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن خالد محمود مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے اس مضمون میں کہیں بھی اس ناسٹلجیا کو جملوں کے اندرون سے کسی معمولی روزن کے ذریعہ بھی جھانکنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ چونکہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد ہیں اور شعبہ اردو سے وابستہ ہیں اس لیے وہاں موجود لوگوں پر ان کی نظر گہری ہے لیکن ان کی یہ گہری نظر کس قدر دور اندیش ہے اس کے لیے ان کا مضمون ''ذکر اس پری وش کا'' پڑھنا ہی نہیں چاہیے حفظ کر لینا چاہیے تاکہ اگر کبھی بھی جامعہ ملیہ میں کسی انٹرویو سے سامنا ہو تو خالد محمود دعاؤں کے مستحق قرار پائیں۔'' جامعہ ملیہ کو ادارہ بنانے میں گاندھی جی کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں اور جامعہ ملیہ کو ادارہ بنائے رکھنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور شفیق الرحمٰن قدوائی جیسی ہستیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ تمام حضرات جامعہ میں رہے تو جامعہ ادارہ بنا۔ میری دلیل یہ ہے کہ یہ تمام ہستیاں مولانا محمد علی سے لے کر پروفیسر محمد مجیب تک جامعہ میں تو اب موجود نہیں لیکن ''لطیف صاحب'' کے اندروں میں بہر حال موجود ہیں۔ سب کی روحیں عالم ارواح کو چلی جاتی ہیں لیکن مذکورہ بالا حضرات کا عالم ارواح لطیف صاحب ہیں''، ممکن ہے بہت سے قاری عبداللطیف اعظمی کو نہ جانتے ہیں لیکن یہ خاکہ اس انداز سے انہیں متعارف کراتا ہے کہ قاری عبداللطیف اعظمی کی شخصیت اور ان کے اور صاف ظاہر ہو جاتے ہیں ان کی شخصیت کی نگاری کر کے خالد محمود نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ شخصی مضامین اور خاکے جسے

بظاہر تفنن طبع کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا جاتا۔ اس کا دائرہ جتنا چاہیں وسیع کریں شرط صرف یہ ہے کہ آپ کی ذہانت یا ذکاوت کس درجہ کی ہے۔ آپ سمجھ رہے ہونگے کہ خالد محمود صرف کڑوی گولی کو شہد میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں اور یہی ان کی خوش قلمی ہے ایسا بھی نہیں ہے انھوں نے اپنی بلیغ نظری اور وسیع مطالعے سے لفظ گری کا ہنر بھی سیکھا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ شگفتہ تحریر لکھتے وقت سب سے بڑی ضرورت جس شئے کی پڑتی ہے وہ ہے ایسے الفاظ و تراکیب جو نئے بھی ہوں اور معنی کی ترسیل میں آسانی بھی پیدا کریں تقریباً چاروں خانے اور پانچوں انشائیے میں یہ صفت موجود ہے۔ انتساب سے شروع ہو کر قلم برداشتہ تک ان کی تحریر کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اور آج کے نوجوان ادیبوں کو مطالعے کی دعوت دیتا ہے کہ ''دیکھیے میاں ادب کی خدمت یوں کی جاتی ہے۔''

ہمارے عہد کا استعاراتی اظہار

(ہاؤسنگ سوسائٹی)

قرۃ العین حیدر نام ہے اس ادبی لیجنڈ کا جس نے اردو فکشن کا وقار بالا کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے ادبی قد کا ذکر نہ تو اتنا آسان ہے اور نہ ہی اتنا مختصر کہ جسے چند صفحات کے مضمون میں قلم بند کر دیا جائے لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آمدم برسرِ مطلب کہہ کر جلد از جلد اپنے موضوع کی طرف ہی آجایا جائے۔

میرے پیش نظر ان کا ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' ہے جسے ان کے شاہکار میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور جو 1966 میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا تھا۔ دراصل یہ ناولٹ بھی آگ کے دریا کی طرح بٹوارے کے حالات پر مبنی ہے۔ عینی آپا کا دورِ تحریر 1940 سے شروع ہو کر 2000 پر محیط ہے (2000 کے بعد ان کی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی) اس ساٹھ سالہ دور میں ہند و پاک پر جس واقعہ کا سب سے بڑا اور گہرا اثر پڑا ہے وہ بٹوارہ ہے عینی آپا نے اس تمام واقعے، حادثے اور سانحے کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک ایک اور بہت بڑا مسئلہ ہمیشہ رہا وہ یہ کہ جب انھوں نے اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھ کھولی یعنی 1926 میں اس وقت تک انگریز سرکار اپنی تمام تر ریشہ دوانیوں کے بعد ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو چکے تھے صرف ایک چیز تھی جو ہندوستانیوں میں باقی تھی وہ ان کی جاگیرداری تھی جسے انگریزوں نے بشرطِ وفاداری چند علاقوں میں ودیعت کر رکھی تھی لیکن اس پر انھوں نے اپنی گرفت مضبوط کی ہوئی تھی اور وقتاً فوقتاً وہ ان

جاگیرداروں،تعلقہ داروں اور زمین داروں کو معمولی معمولی باتوں پر بھی صرف اس لیے بھی سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے تاکہ دوسرے جاگیردار وتعلقہ دار ہی نہیں بلکہ عام عوام بھی ان کے رعب میں رہیں اور وہ اس میں کامیاب رہیں۔عینی آپا کی تمام تحریروں کو پڑھنے سے اس امر کا صاف پتہ چلتا ہے ان کی تحریروں کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ جس طرح آزادی کی اولین جنگ 1857 کو سمجھنے کے لیے مرزا غالب کے خطوط کو پڑھنا ضروری ہے ٹھیک اسی طرح ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور دو تہذیبوں کے زبردست ٹکراؤ کو سمجھنے کے لیے عینی کی تحریروں کا پڑھنا ناگزیر ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں عینی آپا نے جہاں ایک طرف بٹوارے کے پہلے کے ہندوستان کا خوبصورتی سے نقشہ کھینچا ہے وہیں بٹوارے کے بعد ان افراد کی تبدیلی ذہن کو بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ناولٹ کے شروعات میں ہی جس طرح انھوں نے جاگیرداری نظام کے کاروبار کو ایک فیصلے کی محفل منعقد کر کے پیش کی ہے وہ اس پورے نظام کے جبر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔

''سورج کی روشنی تیز ہوئی کیمپ میں چہل پہل شروع ہوگئی۔آم کے باغ میں اجلاس لگ گیا دور دور تک کھیت کی منڈیروں کے ساتھ یکّے ،ادھے، بہلیاں اور سائکلیں کھڑی تھیں۔اہل کار عرضی نویس، محرر، کسان، زمیندار، گواہ، موکل درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ دو کہار ایک ڈولی اٹھائے اجلاس کی سمت آئے ڈولی درخت کے نیچے رکھدی گئی اس کے اندر بیٹھی عورت آہستہ آہستہ رونے لگی۔مقدمے کی سماعت کا آغاز ہوا عورت نے اپنا بیان دیا۔پھر وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔''

اس پہلے حصے میں جو کردار ہمارے سامنے آتے ہیں وہ ہیں مرزا قمرالدین احمد کی اہلیہ جنھیں لوگ میم صاحب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انگریز نژاد ہیں لیکن انگریزی انھیں واجبی سے آتی ہے اور ان کی چھوٹی سی بیٹی جو ہاتھی پر سوار ہو کر مسماۃ ثریا سلطان عرف بسنتی بیگم کے سامنے سے گزرتی ہے جس کی ماں اپنے بیٹے کے قتل اور بارہ سالہ ثریا کے اغوا کا کیس لے کر تعلقہ دار کے عدالت میں حاضر ہے اور رو رہی ہے بارہ سالہ اس بچّی بسنتی بیگم نے جب اپنی عمر سے کچھ چھوٹی بچی کو ہاتھی پر سوار دیکھا تو اسے پریوں کی کہانیوں والی پری یاد آ گئی اور اس کی تصویر زمین پر اکیرنے لگی۔کہانی رفتہ رفتہ آگے بڑھتی ہے اور مختلف حالات کے تحت بٹوارہ ہو جاتا ہے لوگ ادھر سے ادھر منتقل ہو جاتے

ہیں پریوں جیسی لگنے والی لڑکی جسے سارے علاقے کے لوگ چھوٹی بٹیا کے نام سے جانتے ہیں کراچی میں آ کر ایک بوسیدہ مکان میں اپنی ماں میم صاحب کے ساتھ مقیم ہوتی ہے اور پھر اپنے علاقے کے ایک معمولی کارندے کے بیٹے جمشید علی کے یہاں جو یہاں ایک بڑا کاروباری ہے نوکری کرتی ہے۔ شروع شروع میں وہ ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے ہیں لیکن بڑے ڈرامائی انداز میں جب ان دونوں کے درمیان بسنتی بیگم جواب معروف آرٹسٹ ثریا حسین ہوگئی ہے کا داخلہ ہوتا ہے تو پھر اس کا راز کھلتا ہے کہ ثریا مرزا کون ہے۔

عینی آپا کے تمام ناول اور ناولٹوں کی طرح اس ناولٹ میں بھی کرداروں کی بہتات ہے۔ لیکن ان تمام کرداروں کے بیک گراؤنڈ میں جو یکسانیت ہے وہ صرف یہ کہ یہ سب بدلتی ہوئی تہذیب اور اس کے مختلف رنگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عینی آپا کے اس ناول میں مارکسیت ایک خاص انداز میں رونما ہوتا ہے اور بڑے ہی عجیب انداز میں اس کا انجام ہوتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں قرۃ العین حیدر مارکسزم سے متاثر تو ہیں لیکن ان کے لیڈروں کے رویّے سے بے حد نالاں بھی۔ اس ناولٹ میں سلمان مرزا ایک ایسا ہی کردار ہے جو مرزا قمر الدین کا لڑکا اور چھوٹی بٹیا سلمیٰ مرزا کا بھائی ہے۔ ماں باپ کی خواہش ہے کہ وہ کمپٹیشن کے اگزام میں بیٹھ کر اعلیٰ عہدے دار بنے لیکن وہ مارکسزم سے متاثر ہو کر سب کچھ چھوڑ دیتا ہے اور فکری طور پر ہی نہیں بلکہ پوری طرح سے کمیونسٹ بن جاتا ہے بٹوارے کے بعد وہ پاکستان بھی جاتا ہے لیکن وہاں وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا جاتا ہے۔ عینی آپا نے اس ناولٹ میں جہاں دو تہذیبوں کی رسّہ کشی کو پیش کیا ہے وہیں عورتوں کے مسائل کو بھی سامنے رکھا ہے جمشید اور اس کی منکوحہ منظور النسا کی شادی جو جمشید کی چچازاد بہن ہے اور پھر ان کا طلاق اور آخر میں اس کی موت ناول کو انتہائی سنگین صورتحال سے دو چار کر دیتے ہیں۔ عینی آپا کا کمال ہے کہ وہ ہر ناول یا ناولٹ میں جس طرح مسائل کو پیش کرتی ہیں ایسا لگتا ہی نہیں کہ وہ اسے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ مسائل کرداروں کے ساتھ خود بخود سامنے آنے لگتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہاؤسنگ سوسائٹی اس ذہن کے لوگوں کو معقول جواب فراہم کرتا ہے جن کو لگتا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ایک خالص اسلامی ملک کا نقشے میں اور

اضافہ ہو جائے گا لیکن ہوتا اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں ہندوستان کے مشترکہ کلچر اور تہذیب کی جس طرح نمائندگی ملتی ہے اسے شاید ہی کسی اور اردو کے قلمکار نے اس طرح پیش کیا ہو۔ جمشید جب پاکستان میں سیٹل ہو جاتا ہے اور بڑا کاروباری بن جاتا ہے تو اسے اپنی بیٹی کا خیال آتا ہے جو ہندوستان میں اس کی مطلقہ بیوی کے ساتھ ہے وہ اسے لینے اپنے آبائی گاؤں آتا ہے اور جب وہاں وہ اپنے چچا یا خسر سے اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھتا ہے تو اسے جواب ملتا ہے:

> ''ہم خود پڑھاتے ہیں اردو اور قرآن شریف، شمبھو بھیّا انگریزی بھی پڑھا دیتے ہیں اے، بی، سی، ڈی۔ گوسائیں بھیّا اسے ہندی پڑھا رہے ہیں۔ سید مظہر علی نے فخر سے بتایا جمشید کو ایسا محسوس ہوا جیسے گاؤں کے لوگ اس کی بیٹی کو ذاتی ذمّہ داری سمجھتے تھے۔ وہ یہ کہنے ہی والا تھا کہ اس کا ارادہ ہے کہ کراچی لے جانے کے کچھ عرصے بعد وہ فرحت النسا کو تعلیم کے لیے سوئٹزر لینڈ بھیج دے مگر اب چچا ابا اور شمبھو دادا اور گوسائیں کاکا کو یہ بتاتے ہوئے اسے بے حد شرم آئی۔''

مندرجہ بالا اقتباس صرف فکشن کا حصہ نہیں بلکہ حقائق کی روداد ہے جس کے بل پر ہندوستان کے لوگ آج بھی ساری دنیا میں اپنی ایک الگ اور قابلِ مبارکباد شناخت رکھتے ہیں اور یہی وہ حصہ ہے جسے لکھ کر عینی نے ادب کی دنیا میں بھی حقائق کی روداد لکھنے کی مدعی قرار دی گئی ہیں۔ عینی نے کبھی بھی ناسٹلجیا کو منفی انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ وہ اس کے لیے ایک معقول جواز فراہم کرتی ہیں اپنے ادب پارے میں اس کے لیے گنجائش نکالتی ہیں کردار خلق کرتی ہیں ان کرداروں کی تاریخی حیثیت کی پڑتال کرتی ہیں تب جا کر اسے پیش کرتی ہیں۔ عام طور پر لوگ یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ عینی آپا نے جاگیردارانہ گھرانے میں آنکھ کھولی اور ان کے فن پارے میں اس طبقہ کی بہترین نمائندگی ملتی ہے یہ حقیقت تو ہے لیکن ہاؤسنگ سوسائٹی میں انھوں نے جاگیردارانہ سماج پر

جس طرح گرفت کی ہے اور اس کے لیے جس طرح کا بیک گراؤنڈ انھوں نے خلق کیا ہے اسے دیکھ کر ایسا نہیں لگتا۔ ناولٹ کے آخر میں ناولٹ نگار نے جس طرح اس کا اختتام کیا ہے وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کو پوری طرح اجاگر کر دیتا ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی ہے کیا ایک ایسا استعارہ جس کے ذریعہ سماج کے اس طبقے کو اکھاڑ دکھانا مقصود ہے جو صرف ذاتی مفاد اور پیسے کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں جگہ حاصل کرنے کے لیے جو کچھ فروخت کرنا پڑتا ہے اسے ناول نگار کی زبانی سنیے ناولٹ کا یہ وہ حصہ ہے جہاں جمشید یہ جان چکا ہے کہ اس کی پرسنل سکریٹری ماضی کی جاگیردار چھوٹی بٹیا ہے جو پریوں کی طرح ہاتھی پر بیٹھ کر سیر کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ایک خط لکھتا ہے اور کہتا ہے۔

> بٹیا میں در پردہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد اور اعانت کروں گا اور آپ کو کسی بھی دفتر میں ایک معقول ملازمت دلوادوں گا۔ آپ کی اور آپ کی والدہ صاحبہ مکرمہ کی خدمت میرا فرضِ اولین ہے۔ بٹیا۔۔۔ اب میں آپ کے بزرگ کی حیثیت سے چند پند و نصائح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ دنیا بڑی ذلیل جگہ ہے میں بھی دنیا کا ایک فرد ہوں۔ آپ کے بھائی نے دنیا سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ مجھے یقین ہے اور امید ہے کہ بہت جلد اسے معلوم ہو جائے گا یا شاید معلوم ہو چکا ہو کہ اس کے تجزیے اس کی انتہا پسندی اور آئیڈیلزم قطعاً غلط ہے۔ آپ نے اپنے حالات اور اپنی مجبوریوں کے تحت میرے ذریعہ دنیا سے ایک حد تک سمجھوتہ کر لیا جس طرح ثریّا نے میرے ذریعہ دنیا سے سمجھوتہ کر کے سورج کے نیچے اپنی جگہ بنالی مجھے یقین ہے کہ قطعی فیصلہ کرنے سے

قبل اسے شدید ذہنی کش مکش کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ مگر اسے
معلوم ہو چکا ہے اور آپ بھی دیکھ چکی ہیں کہ آج کی دنیا
ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے جس میں ذہنوں
دماغوں، دلوں اور روحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید وفروخت
ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فن کار دانش ور، عینیت پسند اور خدا
پرست میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں میں خود
اکثر ان کی خرید وفروخت کرتا ہوں۔
میں یہ سب باتیں آپ کو اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ ذہنی
طور پر بڑی ہو جائیں اور زندگی کی طرف سے کسی قسم کے
مزید الوزن اور خوش فہمیاں آپ کے دل میں باقی نہ رہیں
ورنہ آپ کو مرتے دم تک مزید صدمے اٹھانے پڑیں گے۔

آپ نے دیکھا کہ قلمکار نے کس خوبی کے ساتھ نئی تہذیب کے ساتھ در آئی نئی ذہنی تہذیب کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور جن باتوں پر انھوں نے انگشت نمائی کی ہیں ان تمام چیزوں کی کتنی توانا شکل آج ہمارے سامنے مجسم موجود ہیں ہم دیکھ رہے ہیں محسوس کر رہے ہیں کہ اس آکٹوپس نما عفریت نے ہمارے پورے عہد کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور ہم بے بسی سے اپنی تمام چیزوں کو فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس ناولٹ میں یہ صاف کر دیا ہے کہ:

''جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا اسی عصبیت کے
ہاتھوں اس سماج کے محل جلا دیے گئے۔ مگر ثریا محض اسی وجہ سے
آج ان بنیادی تقاضوں کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہے ماضی کی
محل سرائیں جل کر راکھ ہوئیں مگر ابھی ان ملبوں کی بنیادوں پر
دونوں ملکوں میں نئی بورژوازی کے نئے محل کھڑے ہوں گے کل
کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل کرے گا۔''

یہ وہ حقائق ہیں جن کا انکشاف کرنا اس ناولٹ کا مقصد ہے اور یہ ایقان ہے یا تجربہ یا پھر ایک قلم کار کی دور بینی جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے سماج میں اتنے ذہین وحق پسند قلم کار پیدا ہوئے ہیں۔اسی لیے عینی ایک عہد پر حکومت کرتی رہیں اور آج ان کے انتقال کے بعد ایسا لگنے لگا ہے کہ اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا تو دور اس میں اڑ وار لگانا بھی ناممکن ہے۔

آغا شاعر دہلوی اوران کا عہد

آغا شاعر قزلباش دہلوی کا اصل نام آغا ظفر علی بیگ تھا۔ وہ اصلاً ایرانی النسل کے تھے۔ محمد شاہ رنگیلا کے دور حکومت میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا اور جون 1739ء میں دہلی کو لوٹ کر مال غنیمت کے ساتھ ایران واپس ہو گیا مگر اس کے لشکر میں سے چند لوگ دہلی میں ہی رہ گئے اور ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا انہیں لوگوں میں سے آغا شاعر قزلباش دہلوی کے بزرگ بھی تھے۔ شاعر ان کا تخلص تھا اور ایرانی ہونے کی حیثیت سے قزلباش دہلوی کہلاتے تھے۔ ترکی میں قزل کے معنی سرخ کے ہوتے ہیں اور باش سر کو کہتے ہیں چونکہ ان کے بزرگ سپاہی تھے اور روایت کے مطابق سپاہی سر پر لال ٹوپی پہنتے ہیں اسی لحاظ سے وہ قزلباش کہلاتے تھے۔ رفتہ رفتہ قزلباش کا ایک بڑا قبیلہ بن گیا۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی اسی قبیلہ کے ایک فرد آغا عبد علی بیگ قزلباش کے فرزند تھے۔

آغا شاعر کے آباواجداد کا پیشہ سپہ گہری تھا شروع میں ان کے بزرگ مغلیہ حکومت کے دربار سے وابستہ رہے اور فوجی خدمات انجام دیتے تھے جب زمانے نے کروٹ لی اور مغلیہ حکومت کا زوال ہو گیا تو انگریز برسر اقتدار ہو گئے، نتیجتاً ان کے بزرگوں نے انگریزی فوج ملازمت کر لی یہ سلسلہ ان کے دادا کے زمانے تک چلا مگر ان کے والد آغا عبد علی بیگ نے تیر شکستہ نیاں گاں کو قلم میں بدلا۔ انہوں نے رڑکی اسکول سے اورسیری پاس کر کے مستحکم طور پر سرکاری ملازمت کر لی اور دہلی میں کشمیری دروازہ موجودہ کشمیری گیت کھڑکی ابراہیم خاں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آغا شاعر قزلباش کے والد ایک نوکر پیشہ ہونے کی حیثیت سے اس دور کے حالات سے متاثر ہو کر شعرو

شاعری بھی کرتے تھے مگر ان کا کوئی بھی کلام دستیاب نہیں ہے وہ بنیادی طور پر صوفی منش تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے صاحب زادے شعروسخن کی طرف مائل ہوئے۔ آغا شاعر کی پیدائش بروز یکشنبہ 5 مارچ 1871ء میں ان کے آبائی گھر کشمیری دروازہ کھڑکی ابراہیم میں ہوئی۔ باپ کے اکلوتے بیٹے ہونے کی حیثیت سے ان کی پرورش و پرداخت یوں کہیے کہ مثنوی سحرالبیان کے ہیرو بے نظیر کی طرح ہوئی اور ہوتی بھی کیوں نہیں گھر میں خدا کا دیا ہوا بے شمار مال واسباب تھا ساتھ ہی ان کے والد آغا عبدعلی بیگ قزلباش اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کی ماں نہایت ہی نیک خدا ترس، صوم صلوۃ کی پابند پسند اور خوددار خاتون تھیں۔ قدامت پسندی ورثے میں ملی تھی البتہ اس طرح آغا شاعر قزلباش دہلوی بڑے ہی لاڈ و پیار سے پرورش پا کر جب سن شعور میں داخل ہوئے تو ان کے والد نے انہیں اس وقت کے مشہور وممتاز درسگاہ اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ دہلی میں داخل کر ادیا اس وقت کی روایت کے مطابق انہوں نے اردو، فارسی، عربی، انگریزی وغیرہ علوم حاصل کیے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے انگریزی باضابطہ اسکول یا درسگاہ میں نہیں پڑھی بلکہ لگن، مطالعہ، مشاہدہ، کے ذریعہ انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے شیکسپئر کے بعض ڈراموں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا ہے۔ جواب تک غیر مطبوعہ ہیں اینگلو عربک اسکول کی تعلیم کے بعد آغا شاعر قزلباش دہلوی کی باقاعدہ تعلیمی زندگی کا سلسلہ مکمل طور پر ختم ہوگیا۔ آغا شاعر قزلباش کا مطالعہ وسیع تھا ساتھ ہی ترجموں اور انگریزی زبان کے مطالعہ کے ذریعہ اپنی استعداد میں اضافہ کرتے رہے۔

ابھی موصوف نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ ماں کی ممتا سے محروم ہوگئے والدہ کا سایہ سر سے اٹھنا تھا کہ دن بہ دن ماں کی فرقت میں افسردہ رہنے لگے۔ ادھر حالات کے پیش نظر ان کے والد نے دوسری شادی کر لی روایت کے مطابق سوتیلی ماں کا نام سن کر آغا شاعر قزلباش دہلوی کا دل کانپ اٹھا ان کے لیے سکون آرام راحت چین اور اطمنان کوسوں دور ہوگیا۔ گھر کی زندگی ان کے لیے زنداں ہوگئی تھی سوتیلی ماں پھر سوتیلی ہوتی ہے یہ اپنی ماں کے آنکھوں کے تارے تھے سوتیلی ماں سے نہیں بنی مہربان باپ کی ایک نہ چلی چنانچہ ظلم وستم سے تنگ آ کر آغا شاعر ایک

دن گھر سے نکل گئے یا یوں کہیے کہ نکال دئے گئے کئی دن تک بے یار و مددگار بھوکے پیاسے فاقے کی حالت میں شہر کے فٹ پاتھ کا طواف کرتے رہے تین دن حیران و پریشان بھوک سے بے حال نیند سے نڈھال جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں حضرت شاہ کلیم اللہ رحمتہ اللہ جہاں آبادی کے مزار پر آرام اور خدا کی مدد کے طلبگار و امیدوار بن کر بیٹھ گئے۔ زمانے کے پیچ و خم سے گھبرا کر زار و قطار رونے لگے تھکے ماندے تو تھے ہی آنکھ لگ گئی سونے کی حالت میں ان کو تازہ کھانے کی خوشبو آئی اور اس کے ساتھ بیدار ہو گئے جاگنے کی حالت میں دیکھا کہ سامنے زردے کی رکابی رکھی ہے چہار طرف سناٹا دور دور تک انسان کا کوئی نام و نشان نہیں تین دن کے فاقے سے تو تھے ہی کھانا دیکھنے کے بعد بھوک کی شدت بڑھنے لگی۔ بسم اللہ کر کے کھانے لگے رکابی کے سارے چاول کھا گئے اور پانی پیا بعد اس کے موزوں شعر کی شکل میں خدا کا شکر ادا کیا گویا کہ آج سے آغا شاعر قزلباش دہلوی کا دل شاعری کی طرف مائل ہوا جس کو علم خداداد کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ح۔1

تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ تو ختم ہو چکا تھا اس کے بعد وہ حضرت کلیم اللہ کے پیروکار ہو گئے۔ دن بھر گھومتے پھرتے تھے مگر رات کو حضرت شاہ کلیم اللہؒ کے مزار پر عبادت و ریاضت میں رات گزارتے تھے اور اس طرح آغا شاعر قزلباش دہلوی زندگی بھر شاہ کلیم اللہ کے عقیدت مند رہے ان کی حیات میں کبھی ان کی پایۂ استقامت کو لغزش نہ نہیں ہوئی۔ جس عہد میں آغا شاعر نے مشق سخن کی ابتدا کی اس وقت ادب میں دو دھارے خاص طور سے نمایاں تھے ایک طرف تو ہندوستان میں داغ کا طوطی بول رہا تھا دوسری طرف حالی، اکبر، چکبست، آتش، ناسخ، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی اور امیر مینائی وغیرہ کی نئی نظموں نے دھوم مچا رکھی تھی یہ بیسویں صدی کا زمانہ تھا اس زمانہ کے اکثر شاعر و ادیب ان رجحانات سے اثر قبول کرتے تھے اس زمانے میں ''مخزن'' کا اجرا ہوا اس سے نئے رجحانات کو اور تقویت پہنچی۔

آغا صاحب کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز 1890ء یعنی انیسویں صدی کے آخری دہائی سے ہوتا ہے۔ آغا شاعر ماہر فن تھے وہ شاعر، محقق، صحافی، انشا پرداز ناول نگار، ڈرامہ نگار، قصیدہ نگار، مثنوی نگار، غزل گو، رباعی گو اور مضمون نگار تھے ان کا ایک اہم کام قرآن پاک کا منظوم ترجمہ بھی

ہے۔انہوں نے رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے وہ بزرگ کامل تھے وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے ان کی شاعری ہو یا ڈرامہ نگاری، ناول نگاری ہندوستان کے سماجی، سیاسی، اقتصادی مسائل کی تصویر پیش کرتی ہے۔ان کی شاعری اتحاد باہمی بھائی چارگی، اخوت، محبت، شجاعت اور قومی یکجہتی کا ضامن ہے۔

اس طرح آغا شاعر کی شاعری چاہے وہ نظم ہو یا نثر انیسویں صدی کے اواخر دس سال کی اور بیسویں صدی کی چار دہائی پر محیط ہے۔آغا شاعر قدامت پسند تھے مگر انہوں نے نئے رجحانات کو بھی قبول کیا اور جب انہوں نے شاعری شروع کی تو بلا شبہ اپنے استاد فصیح الملک بلبل ہند حضرت داغ کی قائم کی ہوئی روایات پر چلنے لگے مگر ان کے دوش بدوش ان کے یہاں بعض ایسے نئے پہلو بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں جن کو نئے عہد کے بدلتے ہوئے حالات اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے ایک نئے احساس وشعور تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ان دنوں آغا شاعر کو رہبری کی ضرورت محسوس ہوئی جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے ان کی عمر بارہ سال کی تھی کہ وہ سوتیلی ما کی وجہ سے گھر سے نکل گئے تھے اور شاہ کلیم اللہ کے مزار میں پناہ گزیں تھے اب ان کا دل شعروشاعری کی طرف مائل ہوا اور استاد ڈھونڈنے لگے البتہ اس وقت خاندان لوہارو علم وادب کا گہوارہ تھا اور اس کے بانی نواب الٰہی خاں معروف تھے انہیں کوئی اولاد نہیں تھی مگر ان کے بھائی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بیٹے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں تھے وہ نواب الٰہی خاں سے استفادہ کر کے فن شاعری پر کامل دستگاہ حاصل کر چکے تھے ان کے دو بیٹے شہاب الدین احمد خاں ثاقب اور سعید الدین احمد خاں طالب دونوں شاعر تھے ثاقب کے چار بیٹوں میں سے چاروں شاعر ہوئے اور طالب لاولد تھے ہی ثاقب کے بڑے بیٹے شجاع الدین احمد خاں تاباں اور ان کے چچا طالب اس زمانے کے مشہور ومعروف شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے تھے۔

خدا کی مدد شامل حال ہوئی آغا شاعر دہلوی کی ان دونوں کے یہاں رسائی ہوگئی تاباں شعر کے فن میں کامل تھے انہوں نے آغا شاعر کی مکمل حمایت اور رہنمائی کی اور رموز شاعری سے آگاہ

کرنے کی کوشش میں آغا شاعر نے ایک ہفتہ وار اخبار ''آصف الاخبار'' جاری کیا جس کا دفتر ان کے آبائی مکان کشمیری دروازہ کھڑکی ابراہیم خاں میں تھا۔ اس کے ذریعہ وہ ادبی مضامین نظم ونثر لکھتے رہے ان کے رنگین شاعرانہ اور پر کیف مضامین کا ایک مجموعہ ''خمارستان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس میں 37 مضامین ہیں جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں اس لیے ان سارے مضامین کا مزاج ایک سا نہیں ہے لیکن ایک چیز ضروری ہے جو ہر مضمون میں بے حد نمایاں ہے اور وہ ہے آغا شاعر کی شاعرانہ فطرت جو ان کی نثر میں بھی نمایاں ہے جن میں سے اکثر شائع نہیں ہوئے ہیں۔ آغا صاحب اپنے ڈراموں میں کبھی کبھی خود ہیرو کا رول ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار اور ناول نویس تھے ان کے بعض ناول اور ڈرامے ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے انہوں نے قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کر کے کارنمایاں انجام دیا ان کے اس غیر معمولی کام کو اس وقت کے ادیب اور سیاسی رہنا مولانا ابوالکلام ازاد، مولانا اشرف علی تھانوی، خواجہ حسن نظامی بابائے اردو مولوی عبدالحق، شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، مفتی عبدالقدیر قادری بدایونی مفتی اعظم حیدرآباد دکن، مفتی کفایت اللہ مفتی اعظم ہند وغیر جیسے لوگوں نے سراہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مدتوں کی محنت کے بعد 1922ء میں پہلا پارہ انہوں نے اپنی زندگی میں دہلی سے شائع کیا اس پر اکبرالہ آبادی نے ایک خط میں لکھا تھا۔

حضرت آغا تسلیم !''اللہ آپ کو جزائے خیر دے آپ نے کلام اللہ کو نظم کر دیا کوئی اللہ کا بندہ اسے طبلہ اور سارنگی پر گا دے تو مزہ آجائے گا۔'' ح۔2

منظوم ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ کیئے جسے اس میں آغا شاعر نے بسم اللہ اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ یوں کیا ہے۔'' ہے نام سے خدا کے آغاز کا (اجالا) جو مہربان بڑا ہے بے حد جو رحم والا تعریف اس خدا کی جو رب ہے عالموں کا محشر کے دن کا مالک روز جزا کا والی تجھکو ہی پوجتے ہیں ہم تیرے ہیں سوالی سیدھی ڈگر پہ لے چل تابت قدم بنا دے نعمت جنہیں عطا کی ان کی روش سجھا دے (ان کی راہ) جن پر قہر وقضب ہوئے ہیں (نے وہ) کہ جو بھٹک کر گمرا ہو گئے ہیں۔'' انہوں نے قرآن کریم کا منظوم ترجمہ کے علاوہ عمر خیام کی رباعی کا مکمل ترجمہ کیا جس میں دوسو ان کی زندگی میں ''خمکدہ

خیام'' کے نام سے شائع ہوا بقیہ ساڑھے چار سو رباعیوں کا ترجمہ غیر مطبوعہ ہے یہ ترجمہ اردو زبان کے مقتدر ترجموں میں سب سے زیادہ مقبول ترجمہ ہے ان کی اس خدمت کو سراہتے ہوئے عطا اللہ بالوی صاحب نے 1837ء میں لکھا تھا۔

''میں بیا نگ دہل یہ کہنے کے لیے تیار ہوں عمر خیام کا سب سے بڑا سب سے بہتر اور اعلی متر جم دہلی کا مایہ ''ناز شاعر آغا شاعر ہے''۔ح۔3 آغا شاعر کی اس خدمت کو سراہتے ہوئے مالک رام نے لکھا ہے کہ !'' آغا شاعر دہلوی نواز خاں ناز تالپور کی فرمائشوں پر رباعیات خیام کا منظوم ترجمہ اردو میں کیا جو خمکدہ خیام کے نام سے شائع ہوا ۔ح۔4 بیشتر نقادوں کی رائے ہے کہ اردو میں خیام کا اس سے بہتر اور عمدہ ترجمہ کوئی نہیں یہاں نمونہ کے طور پر خیام اور آغا شاعر کے اشعار کو قلم بند کیا جاتا ہے۔

خیام آغا شاعر

آمد سحری نداز میخانۂ ما
کای رند خراباتی دیوانۂ ما
برخیز کے پر کنیم پیمانہ زمی
زان پیش کہ پر کند پیمانہ ما
گرمے نخوری ، طعنہ مزن مستاں را
گر دست دہد، توبہ کنم یزداں را
توفخر بدیدین کنی کہ من مے نخوارم
صد کا رکنی کہ مے غلام است آن را

آئی یہ ندا صبح کو میخانے سے
ای رند شراب خوار، دیوانے سے
اٹھ جلد ،شراب سے ساغر مہر لیں
کمبخت !چھلک جائے نہ پیمانے سے

طعنہ نہ دے مستوں کو، جو ہے مئے سے حذر
ہم توبہ ہی کر لیں گے مصیبت ہے اگر
ہے فخر یہی نا۔ کہ تو میخوار نہیں
سو عیب ہے اور مے سے بد تر بدتر

عمرخیام

ہرچند کہ رنگ دبوی زیباست مراچون
معلوم نشد کہ درطر بخانۂ خاک نقاش
لالہ رخ وچو سروبالاست مر ا
من از بہرچہ آراستہ مرا؟

افسرالشعرا

قدرت نے مجھے حسن دیا تھا کیسا؟رخ
پر یہ نہ کھلا کہ خاک کر نے کے لیے نقاش
پھول سا،قدسرو سے پیارا بخشا
نے پھر مجھ کو سنوارا کیوں تھا؟

عمرخیام

درہر دشتی کہ لالہ زاری بودہ است آن
ہر برگ بنفشہ کز زمین می رویدخالی است
لالہ زخون شہر یار بودہ است
کہ پر رخ نگا ری بودہ است

افسرالشعرا

صحرا میں جہاں لالۂ رنگین ہے کھلا سلطان کا
جو پتی بنفشہ کی زمیں سے پھوٹی تل ہے ،

خون ہے کسی قیصر کا
جو کسی چاند سے رخسار پہ تھا

عمرخیام

نا کر دہ گناہ در جہان کیست بگو؟
من بد کتم و تو بد مکافات کنی
آنکس کہ گنہہ نکر و چون زیست بگو؟
پس فرق میاٰن من و تو چیست بگو؟

افسرالشعرا

نا گردہ گناہ کون دینا میں ہوا
مجھے ہو بدی، تو اس کا بدلہ دے برا
جس نے نہ کیا پاپ وہ کس طرح جیا
مجھ تجھ میں بتا تو سہی پھر فرق ہے کیا؟

عمرخیام

من بندۂ عاصیم رضای تو کجاست
ماراتوبہشت اگر بطا عت بخش
تاریک و لم نور ضیاوی تو کجاست
ایں ضردبود لطف عطائی تو کجاست

افسرالشعرا

پاپی سہی پر تیری رضا ہے وہ کہاں
گر مجھ کو بہشت بندگی سے بخشا
تاریک ہے دل نور ضیا ہے وہ کہاں
اجرت ہوئی یہ لطف وعطا ہے کہاں

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ آغا شاعر فن ترجمہ پر عبور رکھتے تھے۔انہوں نے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ اردو میں ''طلسم بدلہ'' کے نام سے کیا جو بالاقساط ان کے اخبار'' آصف الاخبار'' میں چھپتا رہا انہیں دنوں آغا شاعر نے ایک ماہنامہ'' گلدستہ'' پنجہ نگاریں'' کے نام سے اپنی سرپرستی میں نکالا اس ماہنامہ میں اس وقت کے شاعروں اور ادیبوں کا کلام چھپتا تھا۔آغا شاعر کے یہ دونوں خریدے ایک عرصہ تک شائع ہوتے رہے جس کے ذریعہ سے اردو زبان وادب کو حد درجہ فروغ ملا اور ساتھ ہی آغا شاعر کو میدان صحافت میں شہرت حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ آغا شاعر نے مترجم کی حیثیت سے شکسپئر کے انگریزی ڈراموں کا اردو میں ترجمہ کیا جو غیر مطبوعہ ہے۔آغا شاعر قزلباش دہلوی 1871-1940 اپنے عہد کے ادبی منظر نامے میں نامور نثار اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔وہ بیک وقت شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نگار، مترجم اور کئی رسالوں کے مدیر و صحافی تھے۔داغ دہلوی کے مشہور شاگرد جہاں نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی اور منشی وحیدالدین بیخود، دہلوی تھے۔وہیں آغا شاعر نے اپنے استاد داغ دہلوی کی شاعری کو اس درجہ پھیلایا کہ ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک جا پہنچا۔یہی وجہ ہے کہ وہ جانشین داغ افسر الشعراء جہاں استاد جیسے القاب و خطابات سے نوازے گئے۔انکے انداز بیان کی تشکیل مشاہدے کی قوت احساس کی شدت، جذبے کی جدت اور تخیل کی رفعت کو ان کی شاعری میں بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔''تیر ونشتر'' ان کا واحد دستیاب مجموعہ ہے انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں ۔چند افسانے ان کے مجموعے خمارستان میں ملتے ہیں۔جسے مضامین کا مجموعہ بھی قرار دیا گیا ہے اس میں شامل مندرجہ ذیل افسانے ہیں۔یادوطن، نیا سال، دامان بہار، جوئی اور بارش کا ننھا قطرۂ، ہندوستانی، بڑھو ورنہ کچل دئے جاوگے، پوشیدہ، ایک قطرہ خون کی سرگذشت، باغ بہشت، حسن اردو کا حجاب، پھول والوں کی سیر، چھوئی موئی، وفائے عہد، کھلتا ہوا پتہ، بجھتا ہوا چراغ، ٹوٹا ہوا ہاتھ، انیس و دبیر، خانہ بدوش، جل ترنگ، چاندنی رات دریائے فرات، رنگیلا جوگی، آہ پنڈت رتن ناتھ سرشار، حضرت داغ کی ایک صحبت، اپنے خالق کو پہچان، میری بادشاہت کا زمانہ، غلام ہندوستان، پہلے کی دلی، جمنا کے کنارے، عبرت ناک مشاہدہ، فیروز شاہ کی لاٹ، ایک البیلی

شام، برسات کی بہار، تاجدار دکن کی سوانح عمری، استاد داغ کی اصلاح، ادبی صحبت، میرا گناہ، آغا شاعر کا پیغام۔انہوں ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ناول بھی۔ارمان، ناہید، ہیرے کی کنی، اور نقلی تاجدار، ان کے ناول ہیں ان کے ناول کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے صرف چار ہی ناول لکھے ہونگے اس لیے کہ ''لیلی دمشق'' کو بھی ناول کہا جاتا ہے ''شعلہ جوالہ'' ایک ناولٹ اور ''دامن مریم'' موصوف کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جو ان سے منسوب ہے۔

موصوف اپنے عہد کی ایسی اہم شخصیت تھے جس کے متعلق مولانا شبلی نعمانی، سیماب اکبر آبادی، سر شیخ عبدالقادر، صفی لکھنوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، حامد حسن قادری، سید عابد علی عابد، خواجہ حسن نظامی، عبادت بریلوی، امیر حسن عابدی، مالک رام، مہیشور دیال، وجاہت حبیب اللہ، ویمل جین، عمار رضوی، مہاتما گاندھی، فرمان فتح پوری وغیرہ نے اپنے مضامین میں اپنی قیمتی رائے کا اظہار کیا ہے اور آغا شاعر کے ادبی حیثیت کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت اور انکے ادبی کام پر اب تک کسی بھی یونی ورسٹی میں کوئی تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہوسکا ہے۔آغا شاعر دہلوی کی شاعری میں روایت اور تجربے کا نہایت ہی حسین امتزاج ہے جو نواب مرزا داغ کی شاعری کا سرچشمہ اور پیش خیمہ ہے۔نوح ناروی، سائل دہلوی، بیخود دہلوی کے ساتھ ساتھ اردو شعر گوئی میں موصوف کا اپنا علیحدہ مقام ہے۔آغا شاعر نے ڈرامے بھی لکھے ہیں موصوف مشہور ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری کے استاد تھے۔آغا حشر کاشمیری صحافی بھی تھے وہ ''آصف الاخبار'' اور ''پنجۂ نگاریں'' رسالے کے مدیر تھے انہوں اس وقت کے سماجی، سیاسی، تاریخی، معاشی، اور ادبی مسائل پر بڑی بے باکی کے ساتھ اداریے لکھے اور اس وقت کے مسائل پر محیط وہ بے شمار مضامین قلم بند کئے ان کی نظر سماج اور سیاست کے ساتھ ادب پر بھی گہری تھی۔آغا شاعر کی ایک حیثیت مترجم کی بھی ہے انہوں نے قرآن پاک، رباعیات، عمر خیام اور ایک انگریزی ناول کا ترجمہ اردو میں ''طلسم بدلہ'' کے نام سے کیا ہے جو اس عہد میں معیاری اور ادبی ترجمہ ہونے کا سند حاصل کر چکے ہیں اور اس وقت بھی مقبول عام ہیں۔آغا شاعر قزلباش دہلوی آغا حشر کاشمیری کے استاد تھے ڈرامے کا فن آغا حشر نے خاص طور سے آغا شاعر

دہلی سے ہی سیکھا ہے اس سے آغا شاعر دہلوی کی ادبی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آغا حشر کاشمیری جیسے ادیب نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔'' ح۔5 یوں آغا شاعر دہلوی کی ادبی زندگی کا کارواں اپنی منزل طے کرتا رہا اس زمانے میں شیخ عبدالقادر نے 1901ء میں اردو کا مشہور ماہنامہ ''مخزن'' لاہور سے جاری کیا اور آغا شاعر کو لکھنے کے لیے مدعو کیا اس طرح ان کا کلام ''مخزن'' کے اس ابتدائی دور میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اس سے بھی آغا شاعر کو شہرت ملی۔ 1901ء میں بھی ان کے کلام کا مختصر مجموعہ ''تیرونشتر'' کے نام سے مخزن پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس زمانے میں منشی غلام محمد نے امرت سر سے ایک ہفتہ وار پرچہ ''وکیل'' کے نام سے 1901ء میں جاری کیا۔ ح۔6 اس کے پہلے ایڈیٹر لاہور کے مولوی انشااللہ خاں تھے دو تین سال کے بعد انشااللہ خاں نے ملازمت ترک کر کے اپنا ذاتی پرچہ ''وطن'' ہفتہ وار 1903ء میں لاہور سے جاری کیا۔ ح 6

اس کے بعد کچھ دنوں تک ''وکیل'' کی ادارت خود غلام محمد کرتے رہے پھر انہوں نے 1904ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کو مدیر کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دی مولانا آزاد نے اسے منظور کر لیا ادھر غلام محمد نے آغا شاعر کو پرچے کے حصہ نظم کی خدمت سپرد کی مگر یہ کام زیادہ دن تک نہ چل سکا اس لیے کہ مولانا آزاد آزادی کے علمبردار تھے وہ آزادی کا خواب دیکھ رہے تھے اور آغا شاعر داغ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے انا رومانیت کے شکار تھے وہ شوخی اور بانکپن کے سراپا مجسمہ تھے غرض جلد ہی یہ دونوں وکیل سے الگ ہو گئے مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ کی راہ لی اور آغا شاعر دہلوی نے لاہور کا راستہ اختیار کیا۔ لاہور پہنچ کر ان کی ملاقات فتح علی خاں قزلباش سے ہوئی جو بہت ادب نواز تھے مگر ساتھ ہی حاسد بھی تھے کچھ دنوں تک تو آغا شاعر کی انھوں نے بہت ہی خلوص اور محبت سے خدمت کی مگر جب دیکھا کہ ان کی شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو فتح علی خاں آغا شاعر سے ناروا سلوک کرنے لگے اس لیے آغا شاعر چند دن بعد شیخ محمد رفیع دہلوی کے ساتھ رہنے لگے محمد رفیع سرکاری ملازمت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ آغا شاعر نے قیام لاہور کے زمانے میں اپنے بیٹے آفتاب علی قزلباش کے نام پر ماہنامہ ''آفتاب'' بھی جاری کیا اس

زمانے میں ماہنامہ ''آفتاب'' کا لاہور میں کافی شہرہ ہوا۔تقریباً دو تین سال کی مدت میں ہی اس کے بے شمار خریدار ہو گئے تھے۔انہیں دنوں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے ایک جلسے کے لیے انہوں نے ایک طویل نظم ''یتیموں کی فریاد'' لکھی جو انہیں دنوں ایک کتابچے کی شکل میں مرغوب بک ایجنسی لاہور سے شائع ہوئی۔

آغا شاعر دہلوی کی قادرالکلامی کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ جب لاہور میں تھے انجمن کا جلسہ برکت علی میموریل ہال میں ہو رہا تھا شام کا وقت تھا حسب معمول حاضرین میں نامور ادبا و شعراء تشریف فرما تھے ڈپٹی نذیر احمد دہلوی صدرات کا کام انجام دے رہے تھے آغا شاعر اپنی نظم پڑھ رہے تھے اور مجمع دم بخود ہمہ تن گوش تھا یکا یک بجلی چلی گئی اور ہال تاریک ہو گیا فوراً سر عبد القادر دیا سلائی روشن کر کے آغا شاعر کے دوش بدوش کھڑے ہو گئے تا کہ پڑھنے میں دشواری نہ ہو سر عبدالقادر صاحب نے یکے بعد دو تین بار سلائیاں روشن کیں اتنے میں بجلی آ گئی اور سر عبدالقادر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔بجلی گئی اور آئی اس موقع پر نہ تو آغا شاعر نے پڑھنا بند کیا اور نہ ہی سامعین میں سے کسی نے اپنی جگہ سے جنبش کی اس طرح لاہور کے قیام کے زمانے میں آغا شاعر نے بہت بڑے بڑے کارنمایاں انجام دئے مگر تھوڑے ہی دن میں آغا شاعر کا دل لاہور سے اچاٹ ہو گیا اور انہوں نے لاہور کی سکونت ترک کر دی۔

آغا شاعر دہلوی نے لاہور کو خیر باد کہا اور کلکتہ تشریف لے گئے وہاں ان کی ملاقات نصیر الملک شجاعت علی خاں قونصل جنرل ایران سے ہوئی اور آغا شاعر کو ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع ملا اس مدت میں انہوں نے نصیر الملک کے ایماء پر ایک قصیدہ فارسی میں والی ایران مظفر الدین شاہ کی مدح میں لکھا اس پر شاہ موصوف نے خوش ہو کر آغا شاعر کو اختر الشعراء کا خطاب فرمایا اس لیے ان کے احباب ان کے نام کے ساتھ اختر الشعراء لکھتے ہیں۔انہیں دنوں آغا شاعر کی ملاقات آغا حشر کاشمیری سے ہوئی جو تھیٹر یکل کمپنی چلاتے تھے انہوں نے آغا شاعر کو ڈرامہ لکھنے کی دعوت دی قیام کلکتہ میں انہوں نے بے شمار ڈرامے لکھے جب ڈرامے کے فن پر دستگاہ حاصل کر لی تو آغا شاعر کاشمیری کے کہنے پر وہ بمبئی منتقل ہو گئے۔وہاں پارسی حضرات نے تھیٹر یکل کمپنیاں قائم کر رکھی

تھیں ان کمپنیوں کو آئے دن اسٹیج کرنے کے لیے نئے نئے ڈراموں کی ضرورت ہوتی تھی اس ضرورت کو آغا شاعر نے پورا کیا۔ آغا شاعر کی اس کامیابی پر آغا حشر کاشمیری کو ڈرامہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے آغا شاعر سے اصلاح لی اور ڈرامہ نویسی کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ جو کام آغا شاعر نے شروع کیا تھا آغا حشر نے اسے تکمیل کی منزل تک پہنچا دیا اس طرح انہوں نے آغا شاعر کی عقیدت میں اپنے نام کے آگے ''آغا'' لگا لیا اور آغا حشر کاشمیری کہلانے لگے حالانکہ اس سے پیشتر وہ محمد شاہ لکھا کرتے تھے۔ آغا شاعر کی ادبی شخصیت اپنے زمانے میں مقبول تھی اس کا پتہ اس زمانے کی تحریروں سے چلتا ہے ان کی شخصیت پر ان کے بعد آنے والے ادباء اور شعراء نے بھی۔ تحریری خراج عقید پیش کی ہیں۔ ان میں چند ادیبوں کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ جن سے آغا شاعر کی ادبی شخصیت زیادہ واضح شکل میں سامنے آسکے گی۔

حامد حسن قادری کا خیال ہے کہ !

''آپ پلنگڑی پر لیٹے یوں گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے ہیں چاروں طرف۔ تلامذہ کا جھرمٹ ہے اور ایک صاحب غزلوں کا تبہ سامنے مسودہ رکھے قلم ہاتھ میں لیے ایک ایک غزل پڑھتے جاتے ہیں۔ حاضرین ہر شعر کو غور سے سماعت فرماتے ہیں اور مناسب موقع پر اپنی اپنی رائے کے لقمے بھی دیئے جاتے ہیں اگر اس مشورے سے استاد کی رائے کو بھی اتفاق ہو گیا تو وہی الفاظ غزل میں بنا دیئے گئے ورنہ جو استاد نے بطور خود املا فرمایا بے ہچک وہ اس مقام پر جڑ دیا گیا اس طرح اصلاح کی اصلاح ہو جاتی تھی اور آپس کے تبادلہ خیالات سے معلومات کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا جاتا تھا۔ ح۔6

خواجہ حسن نظامی فرماتے ہیں !

''آغا شاعر قزلباش کا قد درمیانہ تھا جسم دوہرا گداز تھا چہرہ پر گول آنکھیں بڑی بڑی چمکدار اور رسیلی تھیں آواز پاٹ دار تھی جب شعر پڑھتے تھے تو شعر کی تصویر بن جاتے تھے ۔ح۔7

سیماب اکبر آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ !

''برادر مرحوم حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی صرف تخلص کے شاعر نہ تھے بلکہ حقیقی شاعر تھے

ان کی شاعری میں زندگی تھی اور وہ شاعری میں زندگی کی ترجمانی کرتے تھے دلی اسکول اور اسالیب داغ کی تبلیغ ونمائندگی آغا صاحب کا حصہ مخصوص تھا ان کی تمام زندگی خدمت ادب میں گزری میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب وہ منزل شباب سے گزر چکے تھے لیکن جن لوگوں نے ان کی جوانی دیکھی ہے کہتے ہیں کہ ان کی غزل گوئی اور غزل سرائی دونوں قیامت تھی وہ جب اپنی بلند آواز سے غزل پڑھتے تھے تو مشاعرے کے دور دیوار لرز جاتے تھے اور وہ بقول شخصے لوگوں کے گریبانوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر داد لیتے تھے بلند قامت بھرا ہوا بدن رعب دار چہرہ، بڑی بڑی موچھیں کشادہ دامن اور اپنے قد سے لمبا عصا لیکر جب وہ کسی مشاعرے میں داخل ہوتے تھے تو مشاعرے میں موجود یا معین کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے تھے اور آغا صاحب آ گئے آغا صاحب آ گئے کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہو جاتی تھیں۔ حیدرآباد دکن کے مشاعروں میں ان کی غزل سرائی آج تک ایک حدیث یادگار ہے۔ ح۔7

علامہ شبلی نعمانی کا خیال ہے !

''آغا شاعر صاحب دلی کے نادر روزگار شاعر ہیں۔ اردو زبان داں ان سے بڑھکر کون ہوسکتا ہے۔ اس خصوصیت کے علاوہ کہ اردوئے معلیٰ ان کی مادری زبان ہے ان کو لٹریچر اور انشا پرداری کا خاص مذاق ہے۔ ان کی نثر نہایت صاف شستہ اور بے تکلف ہوتی ہے شاعری میں بھی کمال حاصل ہے۔ خیال بندی کے ساتھ بندش کی صفائی اور برجستگی اور روزمرہ محاورات کا نہایت عمدگی سے استعمال ان کے کلام کا خاص جوہر ہے۔ ح۔8

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی رقم طراز ہیں !

شاعر مرحوم تخیل کی تہذیب، الفاظ کی دلاویزی، اسلوب کے اور محاوروں کی صحت میں اپنے استاد کے سچے پیرو تھے۔ شاعر شاعر کا تخیل اونچا تھا ان کی فکر گہری تھی مگر ایسی نہیں کہ انسان کی فہم کو چراغ پا کردے ان کے بیان میں مٹھاس تھی لیکن گلوسوز نہیں۔ کلاسیکل غزل کی تقریباً تمام ضروریات ان کے اشعار میں موجود تھی انہوں نے نظمیں بھی کہیں ہیں اور اچھی کہی ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف کو انہوں نے اپنے شاگرد رشید مہاراج بہادر برق دہلوی کے سپرد کردیا

تھا اور خود غزل کے احیاء میں مصروف رہے۔ مشاعروں میں پڑھنے کا طور اگر چہ محض تحت اللفظ تھا مگر نہایت موثر لہجہ بہت دلاویز تھا ہاتھ اور تیور سے بھی کام لیتے تھے لیکن صرف اتنا کہ شعر کے موضوع کی رسائی قاری تک ہو جائے اور کتھک کے ہاؤ بھاؤ سے دور رہے میں نے ان کے استاد حضرت داغ کے پڑھنے کا انداز سب سے نرالا اور موثر تھا ان سے بہتر پڑھنے ولا میں نے نہیں دیکھا بعد کے شعراء میں یہی فیصلہ شاعر مرحوم کے حق میں ہے۔'' ح۔9

نیاز فتح پوری نے ان الفاظ میں یاد کیا ہے !

وہ نہ صرف دبستان داغ کے بڑے خوش گو و پر گو شاعر تھے بلکہ اس تہذیب و روایتی زندگی کے بھی بہترین نمائندے تھے جو دلی کی اجڑی ہوئی ثقافت دلی کے مشاعروں دلی کے چاندنی چوک، دلی کی جامع مسجد اور دلی کے اکابر علم و ادب سے مخصوص تھی وہ ایک شاعر تھے اور ان کی زندگی کا وہ حسن تھا جس نے ان کی شاعری کو شہرت دوام عطا کی۔'' ح۔10

مجتبیٰ حسین کا خیال ہے !

''آغا شاعر کی پوری شاعری میں خواہ وہ غزل کہہ رہے ہوں یا نظم دو چیزیں بڑی نمایاں ہیں ایک تو یہی سامنے کی چیز ہے جسے ہم زبان کی صفائی کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے ان کی وسیع النظری، زبان کی پختگی اور قادر الکلامی ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ غزل میں جو زبان شوخ، صاف اور چٹپٹی ہے وہ نظموں میں پہنچ کر ایک نئے انداز سے ابھرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں بول چال کا انداز ہ جا بجا ملتا ہے وہ مصرعوں میں پختگی اور برجستگی پیدا کرنے کے علاوہ ایک ہی شعر کے کئی رخوں کو وضاحت سے پیش کرتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا پڑھنے والا نہیں دیکھا ایک طوفان کا منظر ایک زلزلے کا عالم ایک بم پھٹنے کی کیفیت مگر بلا کا اثر سن بھی لیں اور سہم بھی جائیں۔ شعر پر جھومنے کو دل چاہے تو بھی دم سادھے بیٹھے رہیں۔ ح۔11

شیش چند طالب دہلوی !

آغا شاعر کی وفات سے گویا ایک نہیں کئی ہستیاں ایک ساتھ اٹھ گئیں قوم کا محترم، قدامت کا مجسمہ دلی کا زبان داں شاعری کا استاد داغ کا جانشین۔ ح۔12

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خیال ہے کہ !

''آغا شاعر دہلوی کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کو بے کیف اور بے جس نہیں ہونے دیتے چنانچہ ان کی اکثر رباعیوں میں کچھ ایسی غزلیت حیات خیزی رومانیت اسلوب کی دلکشی اور فنی پختگی نظر آتی ہے جو عمر خیام کی رباعیوں کی چغلی نہیں کھاتیں''۔ح۔13

سید وقار عظیم نے لکھا ہے !

''آغا شاعر قزلباش کو اردو والے ایک غزل گو کی حیثیت سے جانتے ہیں جن کی غزلیں رنگین محفلوں کو رنگین بناتی ہیں اور جن کے شعر پڑھکر اب بھی لوگ سر دھنتے ہیں۔''ح۔14

اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد دہلوی جو اردو ناول نگاری کے موجد ہیں انہوں نے اپنے عہد میں آصف الاخبار کے حوالے سے آغا شاعر کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ !

''میں بلاخوف تردد کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے جتنے اخبار میری نظر سے گزرے اور شاید ہی کوئی ایسا ہو جو میری نظر سے نہ گذرا ہو اس کی سی زبان کے اعتبار سے دہلی اس کو شایان ہے اور یہ تعرض اگر ہے تو اتنا کہ بیان واقعات میں جو شاعری کی جھلک مارتی ہے۔''۔ح۔15

مذکورہ بالا بیانات اور خیالات سے آغا صاحب کی شخصیت کے جو جوہر سامنے آتے ہیں وہ داغ اسکول کے ممتاز شاعر تھے ان کے کلام کی پہلی اہمیت یہ ہے کہ خود اپنی جگہ مستند اور تیکھا ہے۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ شعری کمالات کی نشاندہی کرتا ہے ۔تیسری اہمیت یہ ہے کہ آغا شاعر کے بعد اور خود ان کے زمانے میں نئے کہنے والوں کے لیے جو زمین ہموار ہو رہی تھی اس کے ہموار کرنے میں آغا شاعر کی محنتوں کو دخل ہے۔زبان پر ان کی قدرت کسی سے مخفی نہیں بلکہ جتنی ڈرامائیت اور مکالمے کا عنصر ان کے کلام میں ملتا ہے اتنا شاید ہی کسی اور شاعر کے یہاں موجود ہو۔یہی طرز نگارش ان کے ڈرامے میں ملتا ہے۔

آغا شاعر کے متعلق جیسا کہ مشہور ہے کہ وہ قلندرانہ صفت رکھتے تھے ایک جگہ قید ہو کر نہیں رہنا چاہتے تھے وہ آزاد تھے اور آزادی پسند کرتے تھے اس بات کی تجدید ان کی تخلیقات سے ہوتی ہے خاص طور سے ان کی نظموں نے جو جنگ آزادی کی فضاء پیدا کی ہے مثلاً ''بہار ہندوستان'' بھارت

دیوی کو پرنام''''سرزمین ہند''''بھارت ماتا کی فریاد'' جیسی نظمیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ایک طویل نظم''بندے ماترم'' کے عنوان سے لکھی تھی جس میں ہندوستانیت کی خوشبو رچی بسی ہیں یا یو کہئے کہ قومی یکجہتی کا اعلیٰ شاہکار ہے۔آغا شاعر دہلوی آغا حشر کاشمیری سے جدا ہو کر بمبئی سے حیدر آباد اپنے استاد داغ سے ملنے گئے۔داغ کا انتقال ہو گیا تھا شاعر کو اس کا بہت صدمہ ہوا ابھی حیدرآباد میں قیام کرتے ہوئے چند روز ہوئے تھے کہ مہاراجا سرکشن پرشاد جو اچھے شاعر تھے انہوں نے اپنی مصاحبت میں جگہ دے دی اور آغا شاعر ان کے دربار سے منسلک ہو گئے۔1911ء میں دلی میں شہنشاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کا دربار میں بڑے تزک واحتشام اور اہتمام سے ہوا۔ایسے موقع سے ملک بھر سے والیان ریاست حاضری دینے کے لیے آئے مہاراجا سرکشن پرشاد بھی ان کے ہمرکاب تھے آغا صاحب مہاراجا کے ساتھ دہلی آئے اور اپنے والد مرحوم کے ترکے کا تصفیہ کرنے کے لیے چند دن ٹھہرنے کے لیے مہاراجا سرکشن پرشاد سے اجازت لے لی۔آغا شاعر دہلی میں رک گئے اور اس کے بعد نہیں گئے۔انہیں دنوں جھالاوار کے مہاراجا سر بھوانی سنگھ دلی تشریف لائے انہوں نے اصرار کر کے ناز برداری کے ساتھ 1919ء میں اپنے ساتھ جھالاوار لے گئے۔جھالاوار میں ان کی بڑی آؤبھگت ہوئی یہاں پھر آغا شاعر دہلوی نے مہاراجا سر بھوانی سنگھ کی سرپرستی میں آفتاب دوبارہ جاری کیا یہ پرچہ سات برس تک بڑی آن بان اور کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔1926ء میں مہاراجا سر بھوانی سنگھ کا انتقال ہو گیا حکومت کی بساط الٹ گئی لامحالہ پھر آغا شاعر لاہور پہنچے وہاں پر علمی ادبی حلقے میں لوگ انہیں پہلے ہی سے جانتے تھے اور ان کے شاگردوں کی بھی کمی نہیں تھی ان میں آنند شرر بھی تھے۔انہوں نے آغا شاعر دہلوی کا تلمند اختیار کیا اور آغا شاعر نے 1927ء کے شروع میں پھر سے''آفتاب'' کا احیا کیا اور اس تیسرے دور میں یہ پرچہ''آفتاب'' کافی دن تک شائع ہوتا رہا اس قیام کے دوران آغا شاعر نے ہمارا آسمان''بلبلان فارسی''روح نغمہ(غزلیات)''گل برگ''وغیرہ کتابیں مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی کے اردو مرکز اور ناشر کتب فیروز سنز کے لیے لکھیں اس کے علاوہ''آویزۂ گوش'' اور''دامن مریم'' بھی آغا صاحب کی اہم تصانیف ہیں۔دونوں دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔یہ

ساری کہانیاں انھوں نے میاں عبدالعزیز صاحب تاجر کتب لاہور کی بے حد فرمائش پر وقتاً فوقتاً طلبات کے اخلاق کی درستی کے لیے لکھی تھیں۔ اس عہد میں یہ ساری کہانیاں اردوئے معلیٰ میں چھپتی رہیں اور پھر بعد میں انہوں نے ترتیب دے کر لاہور سے شائع کیا۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ادبی زندگی دو ادوار پر مبنی ہے ان کا ابتدائی دور 1880ء سے 1901ء تک کا ہے اور دوسرا 1901ء سے 1935ء پر محیط ہے اس مدت میں آغا شاعر نے بے شمار کتابیں لکھیں ہیں۔ ان کی بہت ساری مطبوعہ کتابیں نایاب اور غیر مطبوعہ ہیں۔ ''لگونہ'' شہادت'' (واقعہ کربلا پر ایک نثری تالیف مبلوعہ یوسفی پریس دہلی 1915ء ''لیلی دمشق'' شائع کردہ آزاد بک ڈپو لاہور ''انور و رضیہ'' ناول شائع کردہ مطبوعہ خادم الاسلام دہلی ''حور جنت'' ''ڈرامہ'' ''پہلی کرن'' ''یاد وطن'' ''دربار ہولی'' ''سکہ روز'' نصف النہار'' (لارڈ تاتھ کلف) ''جلترنگ'' ''سب میر بن'' خدا کے فضل سے دوبارہ زندگی پائی۔ جیسی تحریریں آغا شاعر قزلباش دہلوی کی ادبی شخصیت کو چار چاند لگاتی ہیں۔

تیسری بار بھی آغا شاعر قزلباش دہلوی کو لاہور راس نہیں آیا تو وہ لاہور سے دہلی اپنے آبائی وطن آ گئے اور آخری ایام میں میر علی نواز خاں ناز تالپور والی خیر پور سے رسائی ہوگئی میر صاحب علم دوست اور علم نواز بھی تھے باوجود اس کے کہ ان کی ریاست میں اردو کا چلن برائے نام تھا پھر بھی لکھنؤ، حیدر آباد وغیرہ سے شاعروں اور ادیبوں کو بلا کر اپنا مہمان رکھتے تھے اور شعر و شاعری کی رنگا رنگ محفل کا اہتمام کرتے تھے اس بہانے آغا شاعر بھی بلائے گئے اور میر علی نواز ناز کا دیوان مرتب ہوا جس کی اصلاح آغا شاعر کے ہاتھوں ہوئی حقیقت یہ ہے کہ میر علی خاں نواز ناز نے اپنا دیوان مرتب کرنے لیے آغا شاعر کو اپنا مہمان رکھا۔ آغا شاعر بنیادی طور پر شاعر تھے مگر انہوں نے اردو ادب کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ دنیائے شاعری میں ان کا مرتبہ اظہر من الشمس ہے۔ ان کی غزلوں میں روایت رچی ہوئی صورت ملتی ہے اس روایت میں داغ کے اثرات نمایاں ہیں لیکن انہوں نے داغ کی اس روایت کے ساتھ جرأت مومن ناسخ ''ذوق اور میر مینائی کی قائم کی ہوئی روایت کو کچھ اس طرح سے شیر و شکر کیا ہے کہ ان کی غزلوں میں ان کے مختلف رنگوں سے ایک

قوس قزح کی سی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔آغا شاعر نے اپنی غزلوں میں حسن کا بیان بڑے سلیقے سے کیا ہے۔عشق کی مختلف منزلوں کی تفصیل و جذیات بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کی ہے اوران کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے ان دونوں بنیادی موضوعات یعنی حسن وعشق کو انسانی زندگی کی بنیادی سچائی بنا کر پیش کیا ہے اس لیے ان کے معمولی خیالات میں بھی زیادہ گہرائی نظر آتی ہے اور وہ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل معلوم ہوتے ہیں۔پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان تمام مسائل کا بیان انہوں نے اپنی تہذیبی روایات کے پس منظر میں کیا ہے اس لیے ان کے خد و خال نہ صرف نمایاں نظر آتے ہیں بلکہ اس میں نسبتاً زیادہ دلکشی کا احساس ہوتا ہے۔ایک مخصوص معاشرتی فضا اور مخصوص تہذیبی ماحول کے اثرات ان کی غزل میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں ان کی میٹھی اور رسیلی زبان نے بھی ان اثرات کو نمایاں کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔آغا شاعر کی غزلوں کی غالباً سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو زبان اس میں استعمال ہوئی ہے وہ صرف زبان ہی نہیں ہے ایک رچی ہوئی تہذیبی روایت کا عکس ہے اور ان کی غزلوں کی ہی خصوصیت انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔چند اشعار ملاحظہ ہو۔

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

مجھے یاد ہے میں نہ بھولوں گا شاعر
وہ ہنر نہیں کے منہ پھیر لینا کسی کا

انہیں یہ ضد کے پلک پر سے گر پڑے آنسو
مجھے یہ دھیان کہ محنت ہے رائیگاں کیوں ہو

تم کہاں وصل کہاں ، وصل کی امید کہاں
دل کے بہلانے کو اک بات بنا رکھی ہے

ہے تیری ہی سی شکل مگر شوخیاں نہیں
چپ چپ جب ہی تو ہے تری تصویر کیا کرے

تیز پھر ہوئے جاتے ہی الٹے وہ صداشن کو
نالوں میں خدا جانے یہ بے اثری کیوں ہے
انگار گر یہ پر میرے کس ناز سے کہا
آنسو نہیں تو پوچھتے ہو آستین سے
یہی دن ہیں دعا لیلو کس کے قلب مضطر سے
جوانی آنہیں سکتی میری جان پھر نئے سرسے
میں نے تنہا پا کے جب اس سے کیا اظہار حال
پہلے تو سنتا رہا پھر مسکر ا کر رہ گیا
ذرا نیچے اتر کر بات سن لو
یہ کیا تم آسماں پر میں زمین پر
اک دن برس پڑ وگے ، ہمیں پر ، یہ کھل گیا
کب تک پھر وگے روز میری جان بھرے ہوئے
اے شمع ہم سے سوز محبت کے ضبط سیکھ
کمبخت ایک رات میں ساری پگھل گئی
منتیں کرتی ہے جنون کے منالوں تجھکو
جب میری سامنے روٹھا ہو ا تو آتا ہے
کس کے روکنے سے کب ترا دیوانہ رکتا ہے
بہار آئی چلا میں یہ دھری ہیں بیٹیاں میری
مجھکو آتا ہے تیمّم نہ وضو آتا ہے
سجدہ کر لیتاہوں جب سامنے تو آتا ہے

ان اشعار کے علاوہ آغا شاعر کے کلام میں ہر جگہ کم وبیش ہیتی خصوصیت نظر آتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کی غزلیں اردو شاعری میں اہم مقام رکھتی ہیں۔آغا شاعر نے غزل گوئی کے

ساتھ ساتھ نظمیں بھی لکھیں۔انھوں نے مختلف موضوعات پر خاصی تعداد میں ایسی نظمیں لکھیں جن میں جدید شاعری کی اس تحریک کے اثرات نمایاں ہیں جو آغا شاعر کے زمانے میں شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی ان نظموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر خود اس تحریک سے متاثر تھے اور یہ نظمیں ان کے مشاہدات اور احساسات کی صحیح ترجمان اور عکاس ہیں موضوعات کے اعتبار سے ان کی نظموں کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے۔جیسا کہ اس سے پہلے بھی ان کی نظموں کی خصوصیت کے بارے میں ایک موہوم سا اشارہ کیا گیا ہے انہوں نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں تبرکا ان کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔

کالی گھٹائیں اٹھیں، وہ بر سا ابر رحمت
ہر شاخ میں شگوفہ کو نپل ہری بھر ی ہے
سبزہ مہک چلا ہے کوئل کی کوک سنکر
قمری کا ہر ترنم پر لطف بانسری ہے
چھم چھم برس رہا ہے شملے میں آج پانی
کشمیر گل فشاں ہے، گل بینز قر مزی ہے
دیکھو سنہری کر نیں اور برف کے نظارے
کس حسن پر ہمالیہ قدرت کا سنتری ہے
مہکے ہوئے خیاباں، نکہت سے یا سمن کی
نرگس کی آنکھ میں بھی شوخی نئی بھری ہے
سورج کسے غوطے کھانا وہ قبلہ رخ شفتہ
دامن میں آسماں کے یہ پھل جھڑی چھٹی ہے
متھرا جی گردارے آشام کی نگری میں رم جا
برکھارت میں گوکل دیکھ بندرابن کے جنگل دیکھ
یہ وہ دھرتی ہے داتا جس پر آئے ہیں کنہیا

بہائے وہ صورت وہ تصویر دل پر مارے سو سو تیر
وہ صندل صندل سی کایا آنکھوں نے سکھ درشن پایا
ہاتھ میں مرلی دل میں چین
مگن مگن رہنا، دن، رین

آغا شاعر قزلباش نظم کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی زندگی میں نثر کی طرف پر متوجہ ہوئے اور انہوں نے افسانے، کہانیاں، مضامین، ڈرامے، انشائیے اور ناول بھی جانے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا شاعر صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک انشا پرداز، صحافی، ناول، نگار، ڈرامہ نویس، قصیدہ نگار اور مثنوی نگار وغیرہ تھے۔

آغا شاعر مرثیہ نگار بھی تھے وہ اپنے مرثیوں میں اظہار مطالب کی ایسی تلمیحات سے کام لیتے ہیں اور ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان کے اشعار خود بخود دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آغا شاعر نے یوں تو بہت سے قصیدے لکھے مگر تمام قصیدوں میں ان کا ممتاز قصیدہ ''دربار اعظم'' ہے جو اس زمانے میں نہایت اہتمام سے یوسفی پریس دہلی سے شائع ہوا اس میں تقریباً دوسو اشعار ہیں اس کی زمین بہت مشکل ہے زبان کی خوبیاں ویسے ہی اہل دہلی کا حصہ ہیں آغا شاعر اس بارے میں امتیاز خاص رکھتے ہیں پورا قصیدہ تو بہت طویل ہے یہاں گریز کے چند اشعار نمونتاً قلم بند کرتا ہوں ملاحظہ ہو۔

وہ کیا کہنا ترا جان جہاں اندریت
تیری ہی خاک سے چمکے ہیں ہزاروں اختر
آسماں، تیری زمیں کو جو کہیں زیبا ہے
ذرہ ذرہ ہے تری خاک کا مہر انور
تجھ میں وہ لعل چھپے ہیں کہ نہ تھا جن کا نظیر
تجھ میں وہ گہر نایاب کہ قدرت ششدر
دھرم اوتار، مہا بیر رشی اور منی

وہ جواں مرد ، کہہ ، میدان نہ چھوڑیں مر کر
وہ شہنشاہ اولوالعزم، وہ خدا م قریش
وہ شجاں عان عر ب میر عجم ، گردوں فر
جاں نثار ازلی ، پشت و پناہ اسلام
سر فروشان سر انداز و جلالت پیکر
وہ بہادرکہ بگڑ جائیں تو لے لیں اقلیم
بات پر آئیں تو دم بھر میں الٹ دیں لشکر
وہ حسینان جہاں جن کا نہ پر تو دیکھا
مہرگردوں کی نہ پرتی تھیں نگاہیں جن پر
انتخابات زمانہ حکمائے کامل
فضلائے ادب آموزو طریقت گستر
پاک بازاں حقیقت، سخن آرائے مجاز
معدن علم و عمل ، مخزن تفہیم و نظر
تو وہ ہے جس سے ہوہر اک شہر نے رونق پائی
تو وہے لفظ و معانی کا ہے تو ہی ممصدر
تیرے ہی درسے تولے آئے ہیں اردو والے
بات کرنے کی روشن، لطف زباں کے تیور
تو وہ ہے ، تو نے لٹایا ہے چمن کو اپنے
ہند میں چار طرف ہی تری بخشش کے ثمر
برسوں آداب تلفظ کو کیا ہے تعلیم
درس و تدریس سے ہرشخص ہوا بہرہ ور
پھر خدا جانے یہ کیا ہے کہ زمانہ دشمن

افس احسان فراموشی ارباب ہنر
تجھ کو دل بھی کہیں ، تو بھی ہے ام بلاد
ریش باباپئہ بازی ہے تہ زلف مادر
اب کے بھی دور میں تین ہی رہا سر سہرا
تاج پوشی شہ حم جاہ کی ہے پیش نظر
یہ وہ عالم ہے کہ برسوں نہ کوئی بھولے گا
یہ وہ چرچے ہیں ، زبانوں پہ رہیں گے اکثر
گہما گہمی ہے وہ ہر چار طرف نا خدا
لفظ بھی صاف سنائی نہیں دیتے دب کر

اس طرح آغا شاعر نے اپنی زندگی میں لاکھوں شعر کہے مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اپنا کوئی دیوان خاص اہتمام سے شائع نہیں کیا۔ آغا شاعر دہلوی فن شعر گوئی میں داغ دہلوی کے شاگرد خاص اور بہت جدت پسند شاعر تھے۔ ساتھ ہی وہ نثر لکھ کر ناول نگاری کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سے ناول لکھے۔ مثلاً طلسم بدلہ ''شعلہ جوالا'' (ناول) ''قتل نظر'' (ڈرامہ) ''نقلی تاجدار'' وغیرہ مگر خاص طور سے اردو ادب میں وہ اپنے چار ناولوں کے ذریعہ بحیثیت ناول نگار جانے جاتے ہیں وہ ہے ''ہیرے کی کنی'' ''ناہید'' ''ارمان'' ''نقلی تاجدار'' یہ چاروں ناول ان کے طبع زاد ناول ہیں جس میں ہندوستان کے متوسط طبقے کی خانگی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے ان کی تہذیب وتمدن، معاشی، اقتصادی وسیاسی زندگی کی دکھتی رگ کو قلم بند کر کے آپسی اختلاف بغض، کینہ، حسد، نابرابری دور کرنے اور اخوت مروت، مساوات، بھائی چارگی پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

جس وقت آغا شاعر دہلوی نے ادبی دنیا میں قدم رکھا ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی ۔ ہندوستان کے عام لوگوں کی زندگی دگرگوں تھی انگریزی حاکم ہندوستانیوں کے ساتھ ناشائستہ اور ناروا سلوک کرتے تھے ہندو مسلم کے درمیان نفاق اور اختلاف پیدا کر کے آرام اور سکون سے

زندگی بسر کرتے رہتے عام عوام انگریزوں کے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے اور نفرت کی آگ میں جل رہے تھے اس وقت ہندوستان میں سماج کے تین طبقے تھے ایک تو امرا'' وشرفا'' یعنی نواب لوگ جو انگریزوں کے فرمانروا تھے دوسرا متوسط طبقہ تھا جس کو خوشی میسر نہیں تھی اور تیسرا طبقہ مزدوروں کا تھا جن کی زندگی دوزخ جیسی تھی ایسے ہی برے وقت میں آغا شاعر نے ناول لکھنا شروع کیا اور اپنے ناولوں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے اندر محبت اور انسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی اس لیے ان کا ناول رومانی ہوتے ہوئے بھی اصلاحی فلاحی اور قومی یکجہتی کا ضامن ہے۔

بہر کیف اس وقت کے مشہور شعراء مثلاً ،حالی ،اقبال ، آزاد، چکبست ، مجروح، طالب، ثاقب، راسخ ، برتر ، ذوق، مومن، غالب، امیر مینائی اور جوش وغیرہ نے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے۔آغا شاعر حیات وشاعری مرتبہ مجتبیٰ حسین خاں بہت ہی اہم تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ان کی شخصیت اور فن پر متعدد مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین ان کے رفقاً اور ناقدین نے ان کی زندگی ہی میں اور بعض نے بعد از مرگ تحریر کئے جس میں آغا شاعر اردو ادب میں ایک ہفت شخصیت نظر آتے ہیں۔

آغا شاعر بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے انہوں نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں۔پہلی شادی انہوں نے آغا یعقوب دواشی (سابق مدیر ماہنامہ آجکل) کی بہن سے کی تھی ان کے شاگرد جناب دگمبر پرشاد گوہر دہلوی کے مطابق ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی کچھ دنوں بعد ان کی پہلی بیگم عارضہ قلب کی وجہ سے ملک عدم سفر کر گئیں حالانکہ مرحومہ کی زندگی ہی میں آغا شاعر نے دوسری شادی سیتاپور میں سید امیر حیدر کی صاحب زادی سے کر لی تھی۔

ان کے دادا آصف مشہدی اپنے زمانے کے بہت بڑے اور اچھے شعرا میں سے تھے ان کا ذکر'' صبح گلشن'' میں آیا ہے۔ح۔17

بہر حال اس بیگم سے آغا شاعر کو چار اولادیں ہوئیں۔تین بیٹے اور ایک بیٹی۔آغا شاعر کے سب سے بڑے لڑکے کا نام آغا آفتاب علی قزلباش'' آغا شیر علی قزلباش اور آغا اقبال علی قزلباش تھا سبھی نے ادبی حلقوں میں اپنا نام پیدا کیا یہ لوگ تقسیم ملک کے بعد دہلی سے پاکستان رخصت

ہو گئے ۔آغا شاعر کی سب سے چھوٹی صاحبزادی خدا جانے کیا نام تھا مگر وہ سیماب تخلص کرتی تھیں ۔شاید کہ اب بھی پاکستان میں حیات ہوں ۔انہیں شعر گوئی ورثے میں ملی تھی۔آغا شاعر دہلوی نے اپنی ستر سالہ عمر میں اردو کی جو خدمت کی وہ بہت کم لوگوں کو میسر ہوتی ہے۔حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا انتقال 12 مارچ 1940ء کو ہوا۔موصوف کے آخری ایام بہت عسرت اور طویل علالت میں گزرا۔آغا شاعر دہلوی کا انتقال ظہر اور عصر کے درمیان ان کے آبائی مکان کشمیری دروازہ کھڑکی ابراہیم میں ہوا اور آخری رسوم کی ادائیگی قبرستان علی گنج شاہ مرداں ''صفدر جنگ'' میں کی گئی۔ان کے پختہ مزار پر علامہ اقبال کا یہ مصرع کندہ تھا۔'' آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے''۔اور مرحوم کا یہ شعر بھی کندہ تھا۔

مسکن ہی کوئی قبر سے بہتر نہیں ملتا
آرام کہیں گھر کے برابر نہیں ملتا

مگر تقسیم ہند کے طوفان میں پناہ گزینوں کی آبادی کاری کی وجہ سے مزار شریف کا نام ونشان مٹ گیا۔آغا صاحب مرحوم نے اپنے ایک شعر میں بے نام ونشان ہونے کی پیشن گوئی بھی اس طرح فرمادی تھی۔آخر نہ ہوا درجہ شاعر موئی مٹی کا،

ٹکرا کے ستمگر نے بے نام ونشان کر دی۔ح18

آغا شاعر کے انتقال پر ملال پر کئی حضرات نے قطعات تاریخ و فات لکھے۔رضا علی وحشت نے ہجری میں یوں کہا:

جب کہ آغا محترم شاعر
سوئے دارالفنا ہوئے راہی
شعرا میں بپا ہوا ماتم
عام شغل نالہ و زاری
آج دہلی کی اٹھ گئی رونق
محفل شعر ہوئی خالی

فکر تاریخ جب ہوئی وحشت
شاعر ''محتشم'' صدا آئی

ح۔19

تلوک چند مرحوم نے لکھا !

بعد ان کے ہوئے بہت سے پیدا شاعر
لیکن نکلا نہ کوئی ان سا شاعر
دہلی میں یاد آئے ہر کو اکثر
فخر دہلی ! جناب آغا شاعر
نظم اور غزل میں بھی جو یکتا شاعر
پیدا ہوتا ہے کوئی ایسا شاعر
قادر تھے نظم اور غزل دونوں پر
دہلی کے شاعروں میں آغا شاعر
انوار ازل کا ہو جو شیدا شاعر
اک معنی روشن ہے سراپا شاعر
ایسے ہی شاعروں میں ہے نام ان کا
دہلی میں ہوئے ہیں وہ جو آغا شاعر

ح۔20

آغا شاعر کی ادبی شخصیت پر محاسے اور مکالمے کا کام ایسا نہیں کہ ان کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گیا بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی جہان شعروادب میں دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی شعری اور ادبی خدمات کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیتے رہے ہیں اس کی نمائندہ مثال مجتبیٰ حسین کی مرتب کردہ کتاب بھی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اس لیے کہ 27 اگست 1983ء کو بمل جین نے آغا شاعر دہلوی کی 43ویں برسی منانے کے لیے ایک سیمنار کا انعقاد کیا تھا اس موقع سے اردو کے

مشہور ناقد گیان چند جین، عارف محمد خاں، بابائے ڈاکٹر عمار رضوی، راؤ برندرا سنگھ، مہیشو ردیال وغیرہ لوگوں نے اپنے پیغامات بھیجے تھے۔ یہاں صرف گیان چند جین، بابائے قوم مہاتما گاندی جی، عمار رضوی اور مہیشو ردیال کے خیالات پیش ہیں۔

''یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ آغا شاعر قزلباش پر ایک سمینار منعقد کر رہے ہیں۔ میرا ہمیشہ سے عقیدہ رہا ہے کہ بڑے شعرا کے اہم تلامذہ کے کاموں کو ضروری روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ آتش، ناسخ، غالب، میر و داغ کے اہم شاگردوں میں سے محض معدودے چند ہی پر کچھ لکھا گیا ہے میں سمینار کے لیے مضمون نہیں لکھا سکتا۔ پیغام لکھتے وقت بھی قلم لڑکھڑاتا ہے کیونکہ آغا شاعر کے بارے میں میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا آپ کے تفصیلی مکتوب سے کچھ معلوم ہوا مثلاً یہ کہ آغا حشر ان کے شاگرد تھے اور انہیں کی تقلید میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ آغا کا طرہ لگایا تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ آغا شاعر نے رباعیات عمر خیام یا کلام مجید کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سمینار کے طفیل مجھ جیسے ناواقفوں کے علم میں اضافہ ہوگا۔ ح۔21

سیگاؤں وردھا۔11 ستمبر ۳۹ء

پیارے اقبال

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا کہ آپ کے والد عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر شدید بیمار ہو گئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا انھیں جلد صحت یاب کر دے

ایم۔ کے۔ گاندھی

(ایک خط)

خیرت طلبی

اظہار تعزیت

سیگاؤں وردھا۔9 مئی ۴۰ء

پیارے اقبال
مجھے آپ کے محترم والد آغا شاعر دہلوی کی وفات کی رنجیدہ اطلاع مل گئی تھی مگر تمہارا پتہ نہیں معلوم تھا۔
میں سوچتا رہا کہ تم لوگوں کو اپنی تعزیت کس طرح بھیجوں، اس کا موقع مجھے اب مل گیا اور میں پورے خاندان کو تعزیت بھیج رہا ہوں۔
تمہارا مخلص
ایم۔کے۔گاندھی
ح-22

ڈاکٹر عمار رضوی
وزیر تعمیرات عامہ۔قومی یکجہتی و
پارلیمانی امور

پیغام

مجھے یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ نامور شاعر آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم کی یاد میں ان کی ۴۳ ویں برسی کے موقع پر غالب اکادمی نئی دہلی کے زیر اہتمام ایک سمینار منعقد کیا جا رہا ہے اور اس موقع پر ایک سوڈیز بھی شائع کیا جا رہا ہے۔قزلباش دہلوی مرحوم داغ کے ایک ممتاز شاگرد اور قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ڈرامہ نویس آغا حشر کاشمیری کے استاد تھے۔میں اس موقع پر شائع ہونے والے سوینر کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

(عمار رضوی)
ودھان بھون لکھنؤ
مورخہ ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء۔ح۔23

جناب بمل جین صاحب تسلیم

آپ کا خط ملا، آغا شاعر قزلباش دہلوی کی شان میں جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔ سوینر کے لیے پیغام بھیج رہا ہوں۔

نیازمند

مہیشور دیال

پیغام

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ جناب آغا شاعر قزلباش کی یاد میں ۲۷ اگست ۱۹۸۳ء کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں ایک سمینار کا انعقاد ہو رہا ہے۔ آغا ظفر علی بیگ قزلباش شاعر ایک کامل فن استاد اور مشاق سخنور تھے، ایک تو دہلوی ہونا ہی زبان کے معاملے میں کافی سے زیادہ سند رکھتا ہے۔ اس پر انھیں جناب داغ سا فصیح البیان استاد ملا، یہی وجہ ہے کہ شاعر صاحب کا کلام زبان و بیان کی خصوصیات سے مالا مال ہے، آغا صاحب دیوان ''تیر و نشتر'' کے علاوہ بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے لکھے ہوئے ڈرامے بھی بہت مقبول ہیں۔

میں منتظمین سمینار، اس میں شرکت کرنے والے ادیبوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور سمینار کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ مہیشور دیال۔ ح 24 پچھلے دنوں دہلی اردو اکادمی نے بھی آغا شاعر کے حوالے سے ایک سمینار کا اہتمام کیا تھا جو آغا شاعر قزلباش کی تفہیم کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔ جوش ملیح آبادی کے اس اقتباس کے ساتھ اپنی گفتگو ختم کرنے کی اجازت چاہونگا۔

''آغا صاحب کے زبان میں وہ شیرینی ہے جیسے لعل و نگار وہ لوچ ہے جیسے شاخ گل اور وہ روانی ہے جیسے آب رکنا باد'' ح۔25 جس شاعر کو جوش نے ان الفاظ میں یاد کیا ہو یا جس شاعر و ادیب کی تخلیقات میں شیرینی لوچ اور روانی ہو بھلا جہاں ادب میں اس کی شہرت عام اور بقائے دوام سے کون انکار کر سکتا ہے۔

حوالے:

سونیر 1983ء صفحہ 14 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی

2. خمکدہ خیام صفحہ 8/9 کتب پرنٹرز اینڈ پبلیشرز لمیٹیڈ کراچی 1976ء

3. سونیر 1983ء صفحہ 12 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی

4. سونیر 1983ء صفحہ 10 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی

5. سونیر 1983ء صفحہ 10 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی

6. منقول از رسالہ ''نقد و نظر'' آگرہ 1942ئی

7. منقول از رسالہ ''منادی'' دہلی 1942ء

8. منقول از رسالہ ''چمنستان'' دہلی 1941ء

9. آغا شاعر حیات و شاعری۔ مرتبہ مجتبیٰ حسین خاں صفحہ 151ء

10. منقول از رسالہ ''چمنستان'' دہلی 1940ء

11. آغا شاعر حیات و شاعری صفحہ 295

12. منقول از رسالہ ''سیب'' کراچی مئی 1964ء

13. آغا شاعر حیات و شاعری صفحہ 152

14. آغا شاعر حیات و شاعری صفحہ 155

15. حیات و شاعری مرتبہ مجتبیٰ حسین خان صفحہ 240

16. منقول از رسالہ آج کل مارچ 1947ء

17. حیات و شاعری مجتبیٰ حسین خاں صفحہ 293

18. صبح گلشن صفحہ 419 مطبوعہ شاہجہانی بھوپال 15-12 ہجری

19. از رسالہ انجام کراچی 13 مارچ 1964ء

20. منقول از رسالہ چمنستان دہلی 1941ء

21. منقول از رسالہ ''شعلہ و شبنم'' دہلی 1952ء

22. سونیر 1983ء صفحہ 16 آغا شاعر میموریل سوسائٹی دہلی
23. انگریزی خط سے ترجمہ (منقول از شعلہ شبنم 1953ء
24. سونیر 27 اگست 1983ء گوہر دہلوی
25. سونیر 27 اگست 1983ء گوہر دہلوی
26. منقول از رسالہ چمنستان دہلی مارچ 1946ء

آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری

ادب ایک ایسا ساگر ہے جس میں دنیا جہان کے خیالات کے دریا آ کر گرتے ہیں۔ان کا سوتا کہیں پھوٹتا ہے۔ چادر آب کہیں بنتی ہے اور چشمہ کہیں اور جاری ہوتا ہے۔اردو ادب ہر دور میں نشیب وفراز سے گزرتا رہا ہے۔لیکن ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اس کے لیے نت نئی راہیں ہموار کی ہیں اور ترقی کے راستے پر اسے گامزن کرتے رہے ہیں۔اس طرح شاعروں اور افسانے کے ناول کی صنف بھی ان ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے ناول کے لغوی معنی Novella کے ہیں جو کہ اطالوی زبان کا لفظ ہے جس طرح افسانے کے بارے میں مختلف ناقدین نے اپنی آرا پیش کی ہیں۔اسی طرح اردو ناول میں بھی مختلف ناقدین کی تعریفیں مختلف انداز میں ملتی ہیں۔ چنانچہ رابن سن کروسو کے غیر فانی مصنف ڈینیل ڈنو نے اس فن کی بنیاد ڈالتے ہوئے دو چیزوں کا خاص طور سے لحاظ کیا ہے ایک تو یہ کہ قصہ حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اسے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دینا چاہیے۔اس لیے کہ اگر قصہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا تو جھوٹا ہوگا اور اس کی تصنیف کے ذریعے مصنف جھوٹ بولنے کا عادی ہو جائے گا۔وہ کہتا ہے کہ

''قصہ بنا کر پیش کرنا بہت بڑا جرم ہے یہ اس طرح کی دروغ بینی ہے جو آہستہ میں ایک بہت بڑا سراخ کر دیتی ہے جس کے ذریعے چھوٹ آہستہ آہستہ داخل ہو کر ایک عادت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔''

فیلڈنگ جوانگریزی ناول کے عناصر اربعہ میں سے ہیں یوں رقم طراز ہیں

''ناول نثر میں ایک طربیہ کہانی ہے۔''

یعنی اس کے نزدیک المیہ کہانی ناول کے موضوع سے باہر ہے۔اس طرح چرڈسن کے اس نقطۂ نظر کو رد کرتا ہے کہ کہانی کی غرض نیکی اور اخلاق کا سدھارنا ہے۔فیلڈنگ اسے ہنسنے اور ہنسانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لیے وہ اس میں طربیہ کی شرط لگا دیتا ہے ۔ظاہر ہے کہ یہ تعریف بھی نامکمل ہے۔اس کا ایک ہم عصر اسمولٹ اس نئے فن کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

''ناول ایک پھیلی ہوئی بڑی تصویر ہے جس میں ایک مقررہ پلاٹ کو وضح کرنے کے لیے زندگی کے کردار مختلف جماعتوں کے ساتھ رکھ کر مختلف پہلوؤں سے دکھائے جاتے ہیں۔'' یہ تعریف بھی نا کافی ہے اس لیے کہ اس میں سارا زور پلاٹ پر ہے۔چنانچہ انگلستان کی ایک مشہور ادبیہ کلارا ایوز اس فن کی تعریف یوں کرتی ہیں۔''ناول اس زمانے کی زندگی اور معاشرے کی سچی تصویر ہے جس زمانے میں لکھی جائے۔''

پروفیسر بیکر نے ناول کے لیے چار شرطیں لازم کر دیں۔قصہ ہو،نثر میں ہو،زندگی کی تصویر ہو اور اس میں ربط و یک رنگی ہو یعنی یہ قصہ نہ صرف نثر میں لکھا گیا ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو اور کسی خاص نقطۂ نظر یا مقصد کو بھی پیش کرتا ہو۔حقیقت میں ناول وہ صنف ہے جو حقیقت کی عکاسی کرتا ہو۔زندگی کی سچائی کو بیان کرتا ہو۔صنف ناول نے کئی رنگ بدلے ہیں۔کبھی اس نے رومانی شکل اختیار کی تو کبھی تاریخی ناول کی،کبھی عصری ناول کی تو کبھی رزمیہ و سیاحتی،کبھی اسراری اور کبھی نفسیاتی ناول کی۔غرض یہ مختلف رنگ اختیار کرتا رہا اور دور حاضر تک اردو ناول کے ذخیرے کو مالا مال کرتا رہا۔

ناول کے فن کو مکمل کرنے کے لیے جن اجزاء کا ہونا ضروری ہے ان میں قصہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، مناظر فطرت، زمان و مکاں، نظریہ حیات اور اسلوب بیان کو اہمیت حاصل ہے۔اگر ان میں سے ایک بھی جز کم ہو تو ایسا ناول مکمل ناول نہیں کہلائے گا۔اردو میں ناول کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔یہ صنف ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتی ہے۔جب بھی کوئی ناول نویس لکھتا ہے

تو وہ کوئی نئی دنیا اپنی خواہش کے مطابق نہیں بناتا بلکہ وہ ہماری ہی دنیا سے بحث کرتا ہے وہ وہی چیزیں پیش کرتا ہے جن کا ہماری زندگی سے تعلق ہوتا ہے۔یعنی کہ جس میں دکھ ہو سکھ بھی ہو جنگ بھی ہو صلح بھی ہو موت بھی پیدائش بھی۔ناول نگار نہ صرف تخلیل میں پرواز کرتا ہے بلکہ اس کے قصے کی بنیاد روزمرہ کی زندگی پر استوار ہوتی ہے۔کردار بھی ہمارے جیسے گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں۔ناول ادب کی اہم صنف ہے جو بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی ہماری زندگی کی مختلف گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دیتی ہے۔1 ناول انگری لفظ ہے انگریزی ادب کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا ہے۔2 ناول میں پرانے قصوں، افسانوں اور داستانوں کے برعکس انسانی زندگی کا قصہ ہوتا ہے اس لیے اسے موجودہ عہد کا رزمیہ بھی کہا جاتا ہے۔3 انگریزی زبان میں ناول کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ہو چکا تھا مگر اردو میں اس کا وجود انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہی ممکن ہو سکا۔مولوی نذیر احمد کی ناول ''مراۃ العروس'' کو اردو کا پہلا ناول مانا جاتا ہے جس کی تصنف 1860ء میں ہوئی تھی اردو ناول نگاری کا فن آج اپنے بام عروج پر پہنچ چکا ہے۔اردو میں کئی ایسے ناول عالم وجود میں آچکے ہیں جنہیں بقائے دوام حاصل ہو چکا ہے اور انہیں دنیا کے بہترین ناولوں کی صف میں فخر سے رکھا جا سکتا ہے۔اردو ناول کے فن کو جہاں شرر، سرشار، نذیر احمد اور پریم چند نے پروان چڑھایا وہیں آغا شاعر دہلوی نے بھی اس صنف میں اپنا خون جگر صرف کیا۔اگر چہ آغا شاعر نے اور لوگوں کے مقابلے بہت بعد میں اس میدان میں قدم رکھا پھر بھی ناول کے ارتقاء میں ان کا تعاون فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ان کا یہ تعاون قابل ستائش ہی نہیں بلکہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔آغا شاعر نے بیسویں صدی کے آغاز میں ناول نگاری شروع کی۔انہوں نے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے اس صنف کو مالا مال کیا ہے۔ان کے ناولوں میں فنی دسترس کا احساس بھی ہوتا ہے اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں خاندانی نزاع کے بنیادی مسائل کو پیش کیا ہے وہ اپنے ناولوں کے ذریعہ تعلیم و تربیت نیز سماجی اخلاقی اور معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے ان کے یہاں میں سماج کا جاہل ہونا ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔اگر سماج تعلیم یافتہ ہوگا تو عام لوگ کامیاب زندگی گذار سکین

گے اس کے علاوہ انہوں نے سماج کی کہنہ فرسودہ رسم ورواج کی طرف بھی ذہن کو مبذول کرایا ہے کہ اکثر اس کا انجام پریشان کن اور جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔اس طرح انہوں نے اپنے ناول کے ذریعہ سماج کے اندر خانگی ذمہ داریوں کے احساس کو جگانے کی کوشش کی ہے اور زبردستی شادی کے خطرناک نتائج کو اجاگر کرتے ہوئے تعلیم وتربیت پر کافی زور دیا ہے۔ان کے خیال کے مطابق تعلیم یافتہ سماج اپنے معاشرہ کی گندگی کو اپنے عقل وشعور کے ذریعہ ختم کرسکتا ہے اور اپنی زندگی کو خوشگوار بھی بنا سکتا ہے۔آغا شاعر دہلوی کے ناولوں میں نئے زمانے اور نئے تقاضے کی پکار سنائی دیتی ہے۔ساتھ ہی حقیقت پسندی اور فنکارانہ روش کا آغاز بھی ان کے ناولوں میں ماحول کا صحیح مشاہدہ اور اس مشاہدہ کا منطقی تجزیہ اور پھر ان دونوں کے ساتھ غور وفکر بھی پایا جاتا ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں گھریلو زندگی اور اس کے مسائل اور گھر کی چہار دیواری سے باہر گلی کوچوں، بازاروں، شاہراہوں میں گونجنے والے نعروں کو بھی پیش کیا ہے۔اس صنف میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے ان کے یہاں خالی خولی جذبات نگاری نہیں ملتی بلکہ ان کے خیالات فکر کے تابع نظر آتے ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں اپنے رجحانات ومیلانات اور فلسفہ حیات کا عکس پیش کیا ہے۔ آغا شاعر کے کردار میں جو نفسیات اور تجزیاتی جھلک ملتی ہے وہ اپنے آپ میں مثال ہے۔ماحول کا اثر انسان کی زندگی پر کیسے پڑتا ہے اسے انہوں نے اپنے ناولوں میں بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔اس لیے آغا شاعر کے ناولوں کو اردو میں جس حد تک نظر انداز کیا گیا ہے غالباً اس حد تک نہیں کرنا چاہئے تھا۔آغا شاعر اپنے دور کے نمایاں ناول نگار رہے ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں میں متوسط طبقہ میں پروان چڑھنے والے لڑکے اور لڑکی کی محبت، نفسیاتی جذباتی زندگی اور وہ ماحول جس میں کہ وہ پروان چڑھتے ہیں۔اس قدر تکمیل کے ساتھ اور فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان کی ناول نگاری اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل کر لیتی ہے۔ان کے یہاں اخلاقی تقاضے اور قدامت پسندی کا سراغ ملتا ہے۔اس طرح مشرق پسندی کے اعتبار سے آغا شاعر کو اردو ناول نگاری میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔آغا شاعر کے ناولوں میں ہندستانی رنگ نمایاں ہے وہ انگریزی ادب سے بخوبی واقف تھے اس لیے ان کے ناولوں میں

مغربی تکنیک اور انداز فکر کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ان کے ناول مشرقی حسن کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں انہوں نے فرد کی زندگی اس کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کو موضوع بنایا ہے۔آغا شاعر نے اردو ناول نگاری کے کینوس کو وسیع کیا اور اس سلسلے میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔موصوف اردو ناول کی دنیا میں ایک بے باک اور باغی ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں ان کے ناول خاندانی ٹکراو، بغض، کینہ، کشیدگی اور سماجی روایت سے بغاوت کے حامل ہیں۔خصوصیت کے ساتھ دہلی کے روایتی ماحول اور متوسط طبقہ کے معاشرہ میں ایسے اختلافات کے موضوعات پر انہوں نے کھل کر نشتر زنی کی ہے کہ کبھی کبھی ان کی بے باکی حد کو پار کر جاتی ہے۔لیکن اکثر و بیشتر وہ حق گوئی سے بھی کام لیتے ہیں۔ان کے ناولوں میں زیادہ تر اخلاقی اصلاح بھائی چارگی، اخوت ومروت کے پہلو نمایاں ہیں مگر ان کے ناولوں میں جنس کا پہلو بھی کچھ کم نہیں ہے۔اس کی مثال ان کے ناول ''ہیرے کی کنی'' ہے اور ہو بھی کیوں نہیں کیا عورت اور مرد کے درمیان جنس ایک فطری جذبہ نہیں۔روٹی، کپڑا اور مکان کہ بعد انسان شادی کرتا ہے یہ انسان کی چوتھی اور اہم ضرورت ہے ۔پھر اتنے اہم موضوع کو کیوں نظر انداز کر دیا جائے اس طرح آغا شاعر صاحب بیسویں صدی کے مقبول ترین ناول نگاروں کی صف میں کھڑے ہیں۔انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ بیسویں صدی کے سماج کے بیشتر مسائل پر بڑی چابک دستی سے قلم اٹھایا ہے۔ان کے ناولوں میں موضوع اور فن دونوں کا تنوع ملتا ہے انہیں کرداری نگاری کا بھی بڑا سلیقہ آتا ہے۔ان کے ناولوں میں انسان کے نازک احساسات و جذبات پیچیدگی اور الجھاو کی زد میں ہے ان کے علاوہ موجودہ دور میں آغا شاعر کہ بعد بہت سے نام ہیں جو اردو ناول نگاری کے افق پر ستاروں کی مانند اپنی بھر پور چمک دمک کے ساتھ موجود ہیں۔غرض یہ کہ ناول نگاری اور ناول نگاروں کا ایک کارواں سا نظر آتا ہے جو اپنی منزل کی جانب بڑی تیزی سے رواں دواں ہے ان ناولوں میں عہد حاضر کی منتشر اور مضطرب زندگی کے احوال کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار زندگی کا خواب بھی پنہاں ہے۔اس میں حسن اخلاق اور حسن عمل پر بھی زور دیا گیا ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ہم آہنگی کا درس بھی ملتا ہے جو موجودہ دور کے ناول کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ان ناول نگاروں نے موضوعات

کی رنگارنگی اور وسعت کے ساتھ ساتھ اردو ناول کو دلچسپی اور دلنشینی سے بھی ہم کنار کیا ہے۔ اردو ادب کے مشہور ناقد وقار عظیم نے بھی اس کی حمایت کی ہے۔

آغا شاعر دہلوی کی ناول نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ ایوان اردو شمارہ 5 ستمبر 2002 صفحہ 32 پر یوں رقم طراز ہیں۔'' آغا صاحب کے ناولوں میں نثر نگاری دلکش اور معتدل ہے موسم کی مرقع کشی فردوس گوش ونظر ہے۔ بیانات ضروری اور مختصر ہیں، مکالمے فطری، دلچسپ، برمحل اور برجستہ ہیں ناول میں ڈرامائی انداز کافی ہے۔ عشق وہی رسمی ہے لیکن قصے میں واقعیت کم تخلیقیت زیادہ ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری آغا شاعر کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہیں کہ:

''ان کی زبان ٹکسالی، پاکیزہ، شستہ اور رنگین ہے۔ اس پر روزمرہ محاورے خصوصاً بیگماتی زبان پر بڑی قدرت ہے''۔ شاعر صاحب نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنا سکہ جمالیا۔ تمثیل نگاری اور ڈرامہ نگاری میں مقبول زمانہ کہلائے''

غرضیکہ فن، مواد، موضوع، اور اسلوب ہر اعتبار سے آغا شاعر کی ناول نگاری نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ ناقابل فراموش بھی ہے جسے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ انہوں نے مسلمانوں کی نااتفاقی اور نزاع، خستہ حالت، غفلت پر مبنی'' ارمان'' اور ناہید جیسے عمدہ ناول لکھے اور'' ہیرے کی کنی'' شعور کے رو پر مبنی تخلیق کی ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں اسلامی سوسائٹی، خاندان کی اندرونی معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے ناولوں میں کردار صفات کے مطابق ہوتے ہیں۔ آغا شاعر یوں تو اردو ادب کی مختلف اصناف میں مہارت رکھتے ہیں مگر سب سے پہلے وہ ناول نگار ہیں۔ اخلاقی اصلاح تعلیم اخوت ومروت ان کے ناول کی بنیاد ہیں۔ ان کے یہاں کردار نگاری اور پلاٹ کی بہتات ہے۔ مکالمے دلچسپ دل کش اور موزوں ہیں۔ آغا شاعر قومی اصلاح کے بہت بڑے حامی تھے۔ ان کے ناول بیسویں صدی عیسوی میں عورت اور مرد دونوں طبقوں میں بے حد مقبول ہوئے جن کا اچھا اخلاقی اثر پڑا۔ آغا شاعر کی تحریروں میں روزمرہ محاورے کی صفائی اور زبان کے دلکشی ملتی ہے۔ آغا شاعر کی زبان دلفریب اور پرکشش ہے ان کا اپنا الگ رنگ ہے اور وہ

اسی رنگ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ناول نگاروں میں آغا شاعر منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ویسے ناقدین نے موصوف کو سرے سے نظر انداز کر کے ناانصافی کی ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ اردو ادب میں نفسیاتی ناول کے ارتقاء کو سمجھے تو بغیر اس ایک قدم ابھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یوں تو انہوں نے کل پانچ ناول لکھے ہیں۔ ایک ''طلسمی بدلہ'' انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ ''نقلی تاجدار'' ہیرے کی کنی ''ارمان'' اور ناہید طبع زاد ناول ہیں۔ جو ناول کے فن پر مکمل اترتے ہیں اور اردو ناول میں مقبول بھی ہیں۔ اس بات کی صراحت یوسف سرمست نے بھی اپنی تصنیف بیسویں صدی میں اردو ناول صفحہ 98 کے چوتھے سطر میں کی ہے یہاں یکے بعد دیگرے ان کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

''ارمان''

آغا شاعر دہلوی کا ناول ''ارمان'' اردو ناول کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں دو کردار ''جولی'' اور ناصر کی سچی محبت کو آغا شاعر نے پیش کیا ہے۔ گرچہ ''ارمان'' دوسرے دور کا ناول ہے مگر فنی لوازمات کے اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہے۔ آغا شاعر کے ناولوں کی خشت اول ہے جسے آغا شاعر نے اپنی باریک بینی نکتہ رسی اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کے سبب ''ارمان'' اپنے اصل سے کئی گنا پر لطف اور پر تاثیر ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کو اردو میں نفسیاتی ناول کے اعتبار سے اولین درجہ حاصل ہے۔ ''ارمان'' آغا شاعر کا پہلا ناول ہے جو 1900ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس کا رنگ حد درجہ رومانی ہے جیسا کہ پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ یہ ناول نفسیات بشری پر مبنی ہے۔ پلاٹ کردار نگاری، مکالمے، زبان و ادب ہر لحاظ سے دلچسپ اور مقصدی ناول ہے جس کا موضوع ایک خاندانی نزاع کا غمناک اور دردناک نتیجہ ہے۔ ناول ''ارمان'' میں آغا شاعر نے یہ ذہن نشین کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ خاندان کے ہر فرد کو متحد ہونا چاہئے۔ ایک دوسرے کے جذبات کی قدر کی جائے۔ والدین اپنی اولاد کی مجبوریوں کو سمجھیں۔ اس کے لیے والدین کو بغض، کینہ، حسد سے دور رہ کر اپنا کردار مثالی بنانا چاہئے۔ ناول ''ارمان'' بائیس مختلف ابواب پر منقسم ہے ہر باب کا تسلسل دوسرے باب سے ہے۔

ہر باب کا اختتام کسی نہ کسی نتیجہ اور انجام پر ہوتا ہے۔اس ناول میں آغا شاعر نے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی ہندوستانی مسلم گھرانوں کی روایت کو ملحوظ رکھا ہے۔اس زبانہ میں مسلم سماج میں جو رسم رواج عقیدت، مذہبی، سیاسی، اقتصادی، معاشی عیش وعشرت۔ خاندانی نزاع انانیت غیروں سے دوستی۔ اپنوں سے بیر اور خصوصاً مخلوط خاندان کے اندرونی انتشار اور آپسی رنجشوں کو بڑی چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں خاندانی نزاع پر بڑی اچھی کشمکش ملتی ہے۔ پہلے باب کا خلاصہ اس طرح ہے۔ڈپٹی کمشنر بہادر جنگ نواب بہت بڑے شرفا میں ہیں۔خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔اپنی پرمسرت زندگی مع اہل وعیال کے گذارتے ہیں ان کی دو اولاد میں پروفیسر مظہر اور خورشید عالم ہیں۔مظہر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پروفیسر ہوئے اور خورشید پرانی دلی کی روایت کے مطابق علم سے نا آشنا رہ جاتے ہیں۔دونوں بھائی شادی شدہ ہیں۔ پروفیسر مظہر کی بیوی کا نا حیدری خانم ہے بیٹے کا نام ناصر احمد، محسن وغیرہ ہے۔اس کے بر عکس خورشید کی بیوی کا نام امراؤ بیگم اور ایک حور چہرہ بیٹی جوئی ہے۔ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیگم اپنے وارثوں کے ساتھ کافی خوش ہیں مگر یہی دارالسرور جہاں خورشید کشمکش حیات میں مبتلا ہے۔کچھ دنوں بعد کمشنر کا انتقال ہو جاتا ہے اور خورشید کس وجہ سے قید و بند کی زندگی گذارنے لگتا ہے اس کی بیوی مغموم رہا کرتی ہے۔جوئی اپنے تمام رشتہ داروں کے درمیان باپ کی غیر موجودگی میں مفلوک الحال رہا کرتی ہے اس برعکس پروفیسر اپنے اہل عیال کے ساتھ پرمسرت زندگی گذارتا ہے۔

اس طرح آغا شاعر نے پہلے باب میں پرانی دہلی گھریلو مسائل کو بے باکی سے بیان کیا ہے جس میں کمشنر اور ان کی بیگم کے حالات اور دونوں بیٹوں کا احوال بیان کیا ہے جیسا کہ ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بیٹا تو کافی خوش ہے۔دوسرا قید و بند میں اور ان کی بیگم اور بچے مصیبت میں دن گذارتے ہیں۔پھر یہ نیک صالح عورت امراؤ بیگم خدا پر بھروسہ کرتی ہے اور اپنے خاوند کو یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتی ہے جس کی تصدیق مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے۔

ہائے جس طرح گذاری ہے ہمیں جانتے ہیں
کہاں ڈھونڈوں تجھے اے ناز اٹھانے والے

بحرحال یہ شعرامراؤ بیگم کی مصیبت پر صادق آتا ہے۔البتہ اس کشمکش اور آشوب زدہ ماحول میں مظہر کالڑکا ناصر اور خورشید کی بیٹی ''جوئی'' رشتہ کے چچازاد بھائی بہن ہونے کی حیثیت سے بہت میل جول کے ساتھ کھیلتے ہیں دوسرے باب میں صبح کی منظر کشی کی گئی ہے۔کوئل کوکتی ہے بادصبا جھوم جھوم کر چلتی ہے دل ودماغ کوفرحت بخشتی ہے۔پھولوں کے مسکان اور کلیوں کے چٹخنے کی آوازیں آرہی ہیں۔نمازی صبح کے فرائض سے فارغ ہوکر چہل قدمی کررہے ہیں۔سبھی کی زبان خدا کے ورد میں رطب اللسان ہے اور ایک گلشن ہے جوسرسبز اور شاداب ہے اس کے درمیان لوگوں کوسکون حاصل کر نے کے لیے چوکی دراز ہے اس موسم میں ناصر اور جوئی بھی ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ جوئی کی عمر گیارہ اور ناصر کی تیرہ سال ہے اس دل گدگدانے والے موسم میں دونوں کے محبت کی ابتدا ہوتی ہے سبھی باتوں باتوں میں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے ہیں پھر گھومنے لگتے ہیں تو کبھی تخت پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جیسا کہ آغا شاعر نے دونوں کی محبت کے بارے میں مندرجہ ذیل شعر کہا ہے ۔

وہ تاڑ گئے اب تو خبر چھپ نہیں سکتی
کمبخت محبت کی نظر چھپ نہیں سکتی

غرضیکہ دونوں باغ میں ٹہلتے اور پھول توڑتے ہیں اور پھر جوئی ناصر سے واپس کے لیے اجازت چاہتی ہے اور کہتی ہے ''میں گھر جارہی ہوں ورنہ پریشانی ہوگی'' ناصر روکتا ہے اور کہتا ہے ''کیا بے رخی ہے تم جارہی ہوں'' جوئی جواب دیتی ہے۔مجھے اب گھر جانے دو دیر ہوجاتی ہے تو ماں مارتی ہے اور وہ رونے لگتی ہے ناصر اس کی کلائی پکڑ کر کپڑا اٹھا کر مار کا نشان دیکھتا ہے اور نشان کو اپنے ہونٹوں سے چومتا ہے اس موقع پر آغا شاعر کا مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ کریں ۔

آستین ہٹکے برق چمکی ہے
کیا کلائی ہے کیا کلائی ہے

ان نشانوں کو دیکھ کر ناصر آہ وزاری کرنے لگتا ہے اور کہتا ہے تمہاری ماں تم پر ظلم وستم کررہی ہے آخر کیوں۔میرے بھی تو ماں باپ ہیں۔جوئی کہتی ہے تم امیر ہو میں غریب ہوں تم پر سب کا سایہ

ہے اور میں لاوارث ہوں۔ یہ سن کر ناصر کانپ جاتا ہے اور جوئی کے لیے اس کے دل میں محبت کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ جوئی اس طرح دل دکھانے والی بات نہ کرو۔ تمہاری بات سن کو میں کانپ سا جاتا ہوں اور جوئی وہی پرانی بات دہراتی ہے۔ تم میرے ساتھ کیوں کھیلتے ہو میں تو ایک لاوارث لڑکی ہوں تم امیر باپ کے بیٹے ہو تمہارا ہمارا کیا ساتھ اور جوئی رونے لگتی ہے اور گھر کی طرف چل دیتی ہے۔ ناصر اس کا پیچھا کرتا ہے اور خوش آمدانہ لہجہ میں کہتا ہے کہ جوئی تم ناراض مت ہو چچا کوئی چھ ماہ میں آنے والے ہیں تمہارے لیے اچھے کپڑے اور سامان لائینگے اس جگہ آغا شاعر نے دونوں کی طفلانہ محبت کو بڑی چابک دستی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جب جوئی ناصر سے خوب متاثر ہوتی ہے تو وہ خوش ہو کر ناصر سے لپٹ جاتی ہے اور پھر دونوں پھول تورنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ایک بھونرا جوئی کو ستانے لگتا ہے اور ناصر کہیں چھپ کر سب کچھ دیکھتا رہتا ہے جب جوئی پریشان ہو جاتی ہے تو ناصر کو آواز دیتی ہے۔ ناصر جوئی کو اپنے بازو میں بھر لیتا ہے اور بھونرے سے کہتا ہے ''مان جا بھونرے مان جا''۔ جوئی پھولوں کی مالا بنا کر ناصر کے گلے میں ڈال دیتی ہے اور دونوں اپنے گھر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ پھر تیسرے باب میں آغا شاعر نے کمشنر کی پرمسرت زندگی کو پیش کیا ہے۔ برسات کا موسم ہے عالی شان محل رؤسا لوگ ہیں۔ ساون کا مہینہ ہے لوگ رنگ رلیاں منا رہے ہیں عیش و مستی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ یہاں ناول نگار نے گلی قاسم جان کی رنگا رنگی کو دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بوڑھے جوان، عورت مرد سب مستیاں لے رہے ہیں وہیں ناصر اور جوئی اور ان کے والدین اپنے آبائی گھر میں نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ بیگم کمشنر گاؤ تکیہ لگائے پلنگ پر دراز ہیں چند بیبیاں۔۔۔۔۔ ان کی خدمت میں یک ساعت عفلت نہیں برتتی اور چند قصہ کہانیاں کہتی ہیں۔ موسمی ہوائیں چل رہی ہیں غضب کی چہل پہل ہے۔ یہاں ہر طرح کی بیبیاں گورنمکین جوان لڑکی دوشیزہ، لال گلابی، سرمئی کلک ریزی رنگ برنگ کے دوپٹے اوڑھے ہوئے ملبوس گل اندام نمایاں نظر آ رہی ہیں۔ کچھ ضعیفہ عورتیں سفید پوش مختلف قسم کی ترکاریاں چھیل رہی ہیں۔ دوسری طرف میٹھی ٹکیاں سموسے گلگلے تلے جا رہے ہیں۔ دستر خوان میں لوازمات قرینے سے سجے ہوئے ہیں۔ مہمانوں کو رسوم کے مطابق ہاتھ دھلائے

جارہے ہیں لوگ کھانا تناول فرما کر کمشنر کے ممنون ہورہے ہیں۔کمشنر کا گھر ہر دن عید اور رات شب برات ہے۔اس جگہ ہی ناصر اور جوئی اپنے والدین ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جاچکا ہے۔اس ہماہمی میں ناصر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اپنی ماں کو آڑو پیش کرتا ہے ماں ناصر کو کوستی ہے کہ تم نے اپنے کپڑے گندے کر لیے۔ناصر کی بہن ذکیہ بھی کوستی ہے اور کپڑے دھونے کی تلقین کرتی ہے۔ناصر اپنے کپڑے دھولیتا ہے اور آڑو تقسیم ہونے لگتے ہیں۔حیدری خانم اپنے حصہ کے آڑو جوئی کو دے دیتی ہے اس پر ذکیہ الجھ جاتی ہے اور کہتی ہے کہ جوئی کو ایک زیادہ ملا ہے۔ناصر جوئی کی حمایت کرتے ہیں۔جوئی ایک آڑو ذکیہ کو دیتی ہے اس پر ذکیہ جھلاتی ہے اور امراو بیگم جوئی کو ڈانٹتی ہے۔جوئی شرمندہ ہوتی ہے ناصر جوئی کی حمایت کرتا ہے تو امراو بیگم ناصر کو ڈاٹتی ہے اور کہتی ہے کہ تم کون ہوتے ہو جوئی کی حمایت کرنے والے ادھر حیدری خانم ناصر کو ڈاٹتی ہے اور ناصر ماں کے ڈر سے باہر چلا جاتا ہے اور جوئی بے زبان گھٹ گھٹ کر خون کے آنسو پیتی ہے۔ذکیہ منرے سے آڑو چھیل کر کھاتی ہے۔جوئی اور ناصر ایک دوسرے کے درد میں غرق ہیں اس موقع پر آغا شاعر نے ایک شعر میں دونوں کی ہمدردی ظاہر کی ہے ۔

درد مندوں کو فقط اشارہ ہی کافی ہے
آہ کی ٹھیس لگی آبلہ دل ٹوٹا

جوئی ماں کے ڈر سے دور سے جنگل میں گھومتی ہے جہاں ناصر سے ملاقات ہوتی ہے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر محبت کا دم بھرتے ہیں ناصر کہتا ہے کہ تم یہاں گھوم رہی ہو میں تیری فرقت میں گھٹا جارہا ہوں۔دونوں کوئل کی میٹھی آواز کو یکسوئی سے سنتے ہیں اور اس میں محو ہو جاتے ہیں چوتھے باب میں خورشید قید سے رہا ہو کر پرائیوٹ نوکری کرتا ہے اور خوشیوں اور شاد مانیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اس کی عکاسی مندرجہ ذیل شعر سے ہوتی ہے ۔

دنبالہ ان کی تند نگاہی میں آگیا
کھنچ کر کماں سے تیر گواہی میں آگیا

دیکھتے ہی دیکھتے بیگم کمشنر کا انتقال ہوجاتا ہے۔اس کے اقرباء ماتم کرتے ہیں۔حیدری بیگم

اور مظہر دکھاوے کا واویلا مچاتے ہیں بہ نسبت خورشید اور امراؤ بیگم کے۔ دونوں فریق میں نفرت کا جذبہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ پانچویں باب میں ناصر اور جوئی کی محبت بام عروج پر پہنچ جاتی ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے بیقرار اور بیتاب رہتے ہیں۔ دونوں کی بیباکی دیکھ کر دونوں پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے اور دونوں چہار دیواری کے اندر ایک دوسرے سے الگ قید و بند کی زندگی گذارتے ہیں۔ ایک دن جوئی سیر کو جاتی ہے وہاں ناصر بھی آجاتا ہے۔ دونوں کی ملاقات تنہائی میں ہوتی ہے دونوں آپس میں خوب باتیں کرتے ہیں۔ جوئی بھائی کے خوف سے درخت کی اوٹ میں چھپ جاتی ہے۔ ناصر اس کا آنچل پکڑ کر کھینچتا ہے کہ اس وقت احمد اور مقبول آجاتے ہیں اور ناصر واپس بھاگ جاتا ہے۔ چھٹے باب میں احمد ناصر اور جوئی کے متعلق سب کچھ ماں سے بتلا دیتا ہے۔ امراو بیگم اسے کوستی ہے اور سخت پابندی لگا دیتی ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے لیے پریشان ہوتے ہیں اس طرح ان کے عشق کا پردہ فاش ہو جاتا ہے اور ساتواں باب شروع ہو جاتا ہے !

کیا تصور ہے واہ رے تصویر
اتر آئی ہیں دل میں یار کی آنکھیں
یاں پہ لب لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خاموشی تیری سب کے جواب میں

آٹھویں باب کی شروعات کچھ اس طرح کی ہے۔ دونوں قید و بند میں پریشان ہیں اس کی نشاندہی جوئی کی اس گنگناہٹ سے ہوتی ہے۔

'' چپ رہ دل ناصر ناصر نہ کیا کر ''

نویں باب میں کشمیری دروازہ کا منظر ہے ناصر کالج میں پڑھتا ہے جہاں اس کے جگری دوست محسن سے ملاقات ہوتی ہے اور محسن ناصر سے ہم کلام ہوتے ہوئے یہ شعر پڑھتا ہے ۔

شباب آنے نہ پایا کہ عشق نے مارا
ہمیں بہار کے لالے پڑے خزاں کیسی

دسویں باب میں مظہر اور حیدری بیگم اپنے فرزند ارجمند کے بارے میں سوچتے ہیں کہ کس طرح اس کو اس راہ سے ہٹایا جائے تا کہ انٹرنس پاس کر لے آخر یہ بات طے پاتی ہے کہ والدین نے مکان میرے نام کر دیا ہے اس میں خورشید کا کوئی حق نہیں اس طرح خورشید کو اس مکان سے بے دخل کر دیتا ہے۔ گیارہویں باب میں مظہر اپنے بیٹے کو جادو ٹونے سے بچانے کے لیے ایک پیر صاحب کے پاس لے جاتا ہے اس کے ساتھ اس کی اہلیہ بھی ہوتی ہے وہاں پیر صاحب ان کے ملازم اور دیگر مدعا خواں سے بات ہوتی ہے اور حیدری خانم تعویز لے کر لوٹتی ہے۔ بارہویں باب میں مظہر کسی عشق کا ذکر ہے اور پھر ناصر جوئی کو خط لکھتا ہے اور جوئی رو رو کر آخری سلام کے ساتھ معزرت خواہ ہوتی ہے۔ تیرہویں باب میں ناصر اور جوئی کی شادی کی بات ہوتی ہے مگر ناصر اس شادی سے انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جب میں خود کفیل ہو جاؤں گا پھر شادی کروں گا۔ یہاں آغا شاعر سے بھول ہوگئی ہے کہ جو لڑکا اپنی معشوق کی جدائی میں اپنی جان دے دیتا ہے اس کو قبل اس کے شادی سے انکار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس سے ناصر کے کردار میں فتور پیدا ہو گیا ہے۔ جو عاشق اپنی معشوق کے بچھڑ جانے سے خودکشی کر سکتا ہے وہ اپنی معشوق سے شادی سے کیسے انکا ر کر سکتا ہے۔ صرف اس بنیاد پر کہ خود کفیل بن جاؤں جبکہ لڑکی کے کردار کو آغا شاعر نے بڑی دلکشی سے پیش کیا ہے جب ناصر خودکشی کر لیتا ہے تو جوئی اپنا گلا کاٹ کر اس سے ہم آغوش ہو جاتی ہے جس پر تھوڑی دیر کے لیے یقین کرنا ممکن نہیں مگر یہاں معاشقہ کا بیان ہے جوئی کے دل میں سچی محبت رہی ہو ممکن ہے والدین کی وجہ سے چھپا رکھی ہو مگر جس سے تجاوز کرنے پر وہ بیبا کی کے ساتھ اس محبت کا اعلان کرتی ہے اور نتیجتاً خودکشی کر لیتی ہے۔ اس طرح جوئی بے وفائی کے باوجود باوفا ثابت ہوتی ہے مگر ناصر پیہم وفا کے راستے پر گامزن رہ کر بھی شادی سے انکار کرنے پر بے وفا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں آغا شاعر نے فن اور تکنیک کو بالائے طاق رکھکر جذبات سے کام لیا ہے۔

بہر کیف ناصر شادی سے انکار کرتا ہے۔ امراؤ بیگم اور حیدی خانم میں جھڑپ ہوتی ہے اور اختلاف زور پکڑتا جاتا ہے چودھویں باب میں خورشید مقدمہ ہار کر اپنے اہل وعیال کے ساتھ دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ ناصر کی عمر اٹھارہ اور جوئی کی سولہ ہے اس بات میں آغا شاعر نے

پرانی دلی کے پر فضا ماحول رنگینی کے ساتھ پیش کیا ہے جس میں رسم ورواج کے طور طریقہ غرضیکہ زندگی کے تمام شعبہ کی عکاسی کی ہے۔ مظہر اور حیدری خانم نے اطمینان کا سانس لیا مگر کہاں بلا تو اب آرہی ہے۔ ناصر آشق نامراد جوجوئی سے ملنے کی تاک میں تھا۔ ناصر اپنے دوست محسن کے گھر جاتا ہے حولالہ پیارے لال کا کرایہ دار تھا اس کے گھر کی چھت کے ذریعہ جوئی تک پہونچتا ہے جوئی اپنے بام پر انگڑائیاں لے رہی تھی۔ دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ پندرہویں باب میں مظہر ناصر کو اعلیٰ تعلیم کی ترغیب دیتا ہے۔ سولہویں باب میں ناصر کے اوپر ظلم وتشدد کا ذکر ہے اس کی ذہنی کیفیت کی عکاسی آغا شاعر کے اس شعر سے ہوتی ہے ۔

گرے پڑتے ہیں پہلے سایہ سے
کچھ عجب اپنا حال ہے اب تو

ناصر کی والدین تین دن کے سفر سے واپس آتے ہیں اور بیٹے کے احوال سنکر ماں باپ کی محبت عود کر آتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے پھر سبھی لوگ ناصر سے لپٹ جاتے ہیں۔ ادھر خورشید اور جوئی کی منگنی بلی ماران کے ڈاکٹر اولاد علی کے صاحب زادے محمود علی سے ہو جاتی ہے۔ یہاں آغا شاعر نے فتح پوری، بلی ماران، چاندنی چوک ساتھ ہی دریبہ کلاں، کوچہ بلاقی بیگم کا بہت دل کش منظر کھینچتا ہے اس طرح اس باب میں شادی کی بات پکی ہو جاتی ہے۔ مگر جوئی بہت پژمردہ ہے اس کے برعکس ناصر اٹھارہویں باب میں اپنے والدین سے نالاں ہے۔ وہ جوئی سے شادی کے لیے باپ کو خط لکھ کر ماں کے ذریعہ بھجواتا ہے۔ مظہر کالج سے واپس آتے ہیں تو سارا ماجرا حیدری خانم سناتی ہے۔ مظہر صاحب کہتے ہیں جوئی کی شادی طے پا گئی ہے جو کم ذات ہے گھر میں ڈومنیاں اور ہجڑے ناچتے ہیں۔ اچھا ہوا میرا لڑکا بچ گیا۔ ناصر کا خط پڑھ کر بہت آبدیدہ ہوتا ہے۔ اپنی اہلیہ سے منشی گل بازگی بیٹی کے متعلق بات کرنا ہے حیدری خانم کہتی ہے کہ لڑکا کسی حال میں تیار نہیں ہے۔ ناصر صرف جوئی سے شادی کرے گا۔ ورنہ اس نے اپنی رائے لکھ دی ہے۔ مظہر چاروناچار اپنے بھائی خورشید کو منسوب کے بارے میں خط لکھتا ہے۔ انیسویں باب میں خورشید اس رشتہ کو منظور کر لیتا ہے اور ایک مقرر تاریخ کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس تاریخ تک میں انتظار کروں گا۔ اتنے

میں خورشید کو تار ملتا ہے کہ مہاراجہ بیکانیر نے یاد کیا ہے وہ وہاں کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ بیسویں باب میں جوئی کی حرماں نصیبی مجبوری، اضطرابی بے چینی کو بڑے درد بھرے انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ وہ صرف ناصر کی یاد میں بے ہوش پڑی رہتی ہے۔ اکیسویں باب میں مظہر کو خورشید کا خط ملتا ہے کہ تو اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ دیکھو اچھا ہوا اب لڑکے پر پابندی لگا دو کہ کہیں جانے نہ پائے۔ جوئی کی شادی فلاں تاریخ کو ہو جائے گی پھر سب کچھ بھول جائیگا۔ ناصر پر پابندی لگ جاتی ہے مقررہ تاریخ ٹل جانے سے جوئی کی شادی محمود علی مڈل فیل سے ہوگئی۔ اس بات ناصر کو صدمہ پہنچتا ہے اور وہ اپنے والدین سے شکایت کرتا ہے کہ آپ وعدہ کر رکھا تھا کہ تیری شادی صرف جوئی سے ہوگی مگر ناصر کے والد کی مکاری دیکھئے کہ اس نے اس سے لاعلمی ظاہر کی۔ آخر کچھ دن تو ناصر نے خوب رو رو کر جی ہلکان کیا اور گھر کے سارے افراد کو خوب بہ دعائیں دیں کہ تم لوگوں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا پھر ایک دن وہ عاشق انتقال کر گیا۔ جب ناصر کے انتقال پر ملال کی خبر جوئی کو ملی تو جوئی نے بیبا کی کے ساتھ سسرال اور دنیا والوں کو ٹھکرا کر اپنی سچی محبت کی گواہی دینے ناصر کی میت تک پہنچتی ہے اور خنجر سے اپنے حلقوم کاٹ کر ناصر سے ہمیشہ کے لیے مل جاتی ہے۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ ناصر اور جوئی کی محبت سچی تھی اگر اس دنیا میں نہیں تو عالم برزخ میں دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔ آغا شاعر کے اس ناول کے انجام سے ذہن شوق لکھنوی کی مثنوی زہر عشق اور میر کی مثنوی شعلہ عشق کی طرف جاتا ہے کہ دونوں مثنویوں کا انجام بھی اس طرح کا ہے۔

ناصر جوئی، امراؤ بیگم، حیدری خانم، مظہر ناول ''ارمان'' کے مرکزی کردار ہیں جن کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے اس کے علاوہ خورشید احمد، محسن منیر ذکیہ وغیرہ معاون کردار ہیں جو وقتاً فوقتاً بہ قدر ضرورت نمودار ہوتے ہیں۔ اس ناول میں ایک پورے خاندان کو جگہ دی گئی ہے۔ جتنا اثر ناصر اور جوئی کے کردار پڑتا ہے اتنا کسی پر نہیں اس صورت میں ہم ناصر کو ہیرو اور جوئی کو ہیروئین کہہ سکتے ہیں جوئی اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہے۔ جیسا کہ ناصر نے بغاوت کر کے انانیت کی دیوار توڑ دی۔ جوئی سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے والدین اور رسم ورواج کی پابندی فرض سمجھ کر کرتی ہے۔ ایک طرف جوئی کا کردار اہم ثابت ہوتا ہے کہ جہاں وہ اپنے والدین کی عزت رکھ لیتی ہے تو دوسری طرف محبت

کی خاطر بغاوت نہ کر کے اپنے کردار کو کمزور بناتی ہے جوئی کے لیے یہ ممکن نہ تھا اس لیے کہ وہ مجبور تھی وہ جوئی کہ کردار سے آغا شاعر نے بیسویں صدی کے مسلمانوں کی مشرقی روایت کو زندہ رکھا ہے کہ لڑکا اپنے رومانس کی خاطر بغاوت کر سکتا ہے مگر ایک مشرقی خاتون ایسا نہیں کر سکتی۔

دوسرا کردار مظہر کا ہے جو اپنے عہد کا نمائندہ ہے وہ ہر وقت اپنی بلندی پر رہنے والا انسان ہے اس کا ذہن نیچے آنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنے متکبرانہ مزاج کی وجہ سے خون کو خون نہیں سمجھتا اپنی انا کی خاص بھائی کو تباہی کے راستے پر چلاتا ہے اور بیٹے کے جذبات کو ٹھیس لگا کر لقمہ اجل کا مزہ چکھا دیتا ہے۔ اس کے کردار میں مکاری عیاری، دغابازی بھری پڑی ہے۔ مظہر کا کردار ناول کو جلا تو بخشا ہے مگر تنقیدی نقط نگاہ سے ذلیل اور بدمزہ کردار ہے۔

ناصر کا کردار جوئی کے کردار کے برعکس بے حد اہم اور نمایاں ہے جو ناول کے اوراق میں درخشندہ ستارے کی مانند چمک رہا ہے۔ مگر ناصر کا کردار بھی ایک جگہ کمزور پرتا دکھائی دیتا ہے کہ اس نے شادی سے صرف اس لیے نکار کیا کہ وہ خود کفیل نہیں تھا۔ یہ غدر سچے عاشق کے لیے جائز نہیں۔ ناصر کا باپ اس کے حال سے متاثر ہو گیا تھا اگر ناصر شادی کر لیتا تو مظہر ہو حال میں اس کی کفالت برداشت کر سکتا تھا۔ چند دن دقت ہوتی مگر اس کے بعد حالات سازگار ہوتے چونکہ ناصر کی ماں اس شادی کے لیے من وعن تیار تھی۔ یہ سچ ہے کہ عورت کے سامنے مرد کو جھکنا ہی پرتا ہے۔ ناصر کی ماں اس کی حمایت کرتیں۔ حالات سازگار ہوتے اور ناصر بھی تو روزی کمانے کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔ تنقیدی نقطۂ نگاہ سے ناصر کا کردار بھی کچھ ڈھیلا ڈھالا ہے مگر جہاں وہ زہر کھالیتا ہے تو دنیا میں اپنا مقام بنا تا ہے۔ اس کے برعکس حیدری خانم کا کردار شروع سے آخر تک صاف ہے۔ جیسا کہ ناول کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حیدری خانم امراؤ بیگم کے تعلقات ہمیشہ سازگار رہے ہیں۔ مگر ایک جگہ جہاں ناصر آڑ ولیکر نمودار ہوتا ہے۔ اس جگہ ناصر کی اپنی بہن سے جھڑپ ہو جاتی ہے مگر جوئی کے ساتھ اس کا رویہ مناسب ہے اور اپنا آڑو جوئی کو دے دیتی ہے دوسری جگہ امراؤ بیگم اور حیدری خانم کے درمیان شادی کی بات ہوتی ہے تو حیدری اپنے بیٹے کی نالائقی پر امراؤ بیگم سے الجھ جاتی ہے اور ناصر کا تعلق جوئی سے ختم کرنے کے لیے تعویز لیتی ہے۔ اس طرح

خانم کا کردار بھی نقص سے پاک نہیں ہے لیکن موہم سا نقص ہے جو کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس طرح خانم کا کردار بھی نمایاں ہے امراؤ بیگم کا کردار بھی شروع سے معصوم اور سادہ نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر جب ہم تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو دونوں کا کردار اس میں جہاں باہمی رقابت ہی نہیں بلکہ مروت ،محبت ملتی ہے اس طرح خورشید کا کردار اہمیت کا حامل ہے کہ مظہر نے مقدمہ کر کے زمین سے بے دخل کر دیا شادی کا پیغام دے کر بھی دغا کیا سب کچھ خورشید نے برداشت کیا صرف اتنا کہ سکا کہ بھائی ہے اس طرح اس نے انسانیت کا ثبوت دیا۔ بقیہ سبھی کردار ناول کی طوالت کے لیے ضمنی طور پر دئے گئے ہیں۔

ارمان ایک نفسیاتی ناول ہے اس کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے جو آغا شاعر کی زرف نگاہی کی پیداوار ہے۔ آغا شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان تحریروں میں اس سماج کی عکاسی ہے۔ انہوں نے اپنے دور پر بھی زبردست طنز کیا ہے۔ آغا شاعر کا ناول ''ارمان'' دلچسپی اور دلکشی بھی رکھتا ہے ان کے اس ناول میں چند چھوٹے کردار کے علاوہ سارے کردار شروع سے ناول سے ناول کے صفحات پر ہمارے سامنے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم اس کی ذہنیت اور شخصیت سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ جیسے حیدری خانم ایک معاون کردار بھی حیدری کے کردار سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ناول ''ارمان'' میں جذبات نگاری کی بہتات ہے جس کی بنیاد نفسیات انسانی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر کی ناول نگاری کو رومانی کہا گیا ہے منظر کشی اس ناول کا زیور ہے جو واقعات و کردار سے قریب تر معلوم ہوتی ہے جس میں حسن و عشق کا دریا تلاظم خیز ہے۔

جس طرح شرر ناول کے دریعہ تاریخ کے حوالے سے اسلام کی عظمت کو بروئے کار لائے ہیں اور راشد الخیری نے مشرقی روایات کو قائم رکھنے کی جستجو کی ہے اسی طرح آغا شاعر نے اپنے ناولوں کے ذریعہ اس عہد کے مسلمانوں کی رومانی معاشرتی اور نفسیاتی زندگی پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل موصوف کا یہ رجحان مغربی تہذیب و تمدن کی یلغار سے محافظت کے حوالے سے وجود میں آیا تھا۔ انہوں نے ناول ''ارمان'' کے دزیعہ وہی کام انجام دیا جس کی تلقین اکبر الہ آبادی کی شاعری میں ملتی ہے اس ناول سے آغا شاعر نے مشرقی تہذیب کی مستحکم حمایت کی ہے۔ انسانی

شعور کی رو کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ یہ ناول فن اور تکنیک کے اعتبار سے مکمل اور مستحکم ہے۔
''ارمان'' کے مطالعہ سے فلسفہ حیات کا پتہ چلتا ہے کہ۔ وہ تعلیم یافتہ سماج کی بنیاد ڈالا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ تعلیم نسواں کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ماں کا گود ہی بچوں کا اولین مدرسہ ہوتا ہے۔ اس کے متعلق والگ اور وارن نے کہا ہے'' خاندان ہی انسان کی زندگی کے بارے میں سارے تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر نے ایک خاندان کے نزاع کو روحانی پیار میں پیش کیا ہے۔ جس میں آغا شاعر نے دکھایا ہے کہ والدین کی بے توجہی اور نفرت کے سبب کئی معصوم جانیں ضائع ہوسکتی ہیں۔

اس ناول میں مظہر کے کردار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ مسلم ضرور ہے مگر اس کے خیالات مغربی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ناصر کی شادی جوئی سے نہیں ہونے دیتا۔ اس مغربی رنگ کی بنا پر بھائی سے نفرت کرتا ہے۔ اس طرح مظہر کا کردار آغاز سے اختتام تک مغرب پرستی کا نمائندہ بن گیا ہے۔ کبھی سفر میں ہے تو کبھی کالج یونی ورسٹی میں کبھی شرفا کی مجلس میں نظر آتے ہیں اس طرح آغا شاعر کا ناول ''ارمان'' مشرقی پائداری اور قدامت پسندی کی حمایت اور مغرب پرستی سے انحراف کا آئینہ دار ہے اس کے علاوہ جتنے بھی کردار ہیں سبھی کردار مشرقی پائداری کی اچھی مثال ہیں اس طرح آغا شاعر کے ناول اپنی طرز میں کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔ یہ ناول ان کو خوب شہرت بخشی۔

آغا شاعر جس کی اہتمام اور شدومد سے ارمان اور نفسیات کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ ناول'' ارمان'' میں پوری طرح رواں دواں ہے۔ اپنی انا کی خاصر جو لوگ معصوموں کی قربانی دیتے ہیں اس کے خطرناک انجام کو آغا شاعر نے ناول ''ارمان'' میں خوبصورت پیرائے میں پیش کر دیا ہے۔ انا کے ہجاری والدین کے درمیان کشمکش کی چکی میں دو معصوم پھول کس طرح پستے ہیں مگر انہیں اس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ پھول ٹہنی سے بچھڑ کر خاک کے دامن میں سما جاتا ہے۔ انہیں باتوں پر ناول کا پورا پلاٹ گردش کر رہا ہے۔ ناول'' ارمان'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغا شاعر مشرق کے دلدادہ تھے ہی مگر ساتھ ہی وہ مغربی تہذیب کی رنگارنگی سے اپنی ضرورت کی چیز حاصل کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے ان کا ناول ''ارمان'' مشرقیت پر مبنی ہے مگر مغربیت کا رنگ

بھی دیکھنے کو ملتا ہے جیسے مظہر کا کردار جو پوری طرح مغرب پرست ہے اور پھر اپنے اندر آغا شاعر نے مشرق اور مغرب کی خصوصیات کو پرو دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا شاعر رومانی تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔مگر اس کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔

آغا شاعر نے 1903ء میں ''ارمان'' کے علاوہ ہیرے کی کنی اور دیگر ناول لکھے۔ان کے ناول اردو ناول کی ترقی میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ارمان میں خاندانی نزع اور افراد کی کشمکش کو بڑی چالاکی سے قلمبند کیا گیا ہے۔فرد اور سماج میں جو آویزش ہوتی ہے اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ دونوں کی کشمکش سے اس تہذیبی امتزاج کا نقشہ سامنے آتا ہے جو بیسویں صدی کے پہلے سے ہی ہندوستان میں زور پکڑ رہا تھا۔جس طرح ناصر کا کردار بدلتے ہوئے معاشرہ کا شکار ہے جیسا کہ مشہور ہے بیسویں صدی میں جسم و روح مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں عام انسان کا اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔اس طرح اس عہد میں معاشرے کی تبدیلی سے فرد کی نفسیات پر جو اثرات پڑے اس کو ارمان میں بڑی فنکارانہ خوبیوں سے پیش کیا گیا۔مقصد کے بارے میں کانٹ نے بھی ضرروی اور اہم بتایا ہے یہ اور بات ہے کہ فن مقصدیت کا شکار ہو جاتا ہے مگر ناول میں مقصد کا ہونا فن کا نقصان نہیں کسی مقصد یا نظریہ کے بغیر کسی فن پارہ کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔اس بارے میں ارتھر سلو کا یوں کہنا ہے۔ہم کو فن کی مقصدیت کے متعلق کوئی اقتباس نہیں رکھنا چاہیئے کیوں کہ فن کے پیچھے کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور ہوتا ہے۔7

ارمان مقصدی ناول ہے یہ اور بات ہے کہ ناول نگاروں کی نظر سے دور طاق نسیاں کی زینت بنا رہا ہے اس کا کردار اور پلاٹ اس نوعیت کا ہے کہ خود قاری اس سے نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ اس رول کی اہم ترین خصوصیت کرداروں کی نفسیاتی پیشکش ہے۔فوسٹر نے کہا ہے کہ ''پوشیدہ جذبات کو پیش کرنا ناول نویس کا عظیم کام ہے8

ڈیوڈ سیل نے کہا ہے ''انسانی فطرت سے مکمل آگہی ظاہر کرنا ناول نویس کا کام ہے۔9انسانی فطرت اور نفسیات سے آگہی آغا شاعر کے یہاں بھی ملتی ہے جیسا کہ اس عہد کے دوسرے ناول نویسوں کے یہاں بھی۔آغا شاعر نے انسانی نفسیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔اس لیے کہ وہ

انگریزی منطق، ادب فلسفہ تاریخ غرض ہر شعبہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ارمان میں کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ شروع سے آخر تک موجود ہے۔فرائڈ نے کہا ہے کہ ''فنکار تصور کی دنیا میں اس لیے محو ہو جاتا ہے کہ وہ حقیقی دنیا میں اپنی خواہشات کی تسکین نہیں کر سکتا۔10 اور یہی چیز ارمان میں پیش کی گئی ہے اس طرح ناول میں کرداروں کی خواہش کی تکمیل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے

مگر ناول ارمان کا ہیرو منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتا ہے وہ جذبات و خواہشات دبا لیتا ہے۔ جو فرائیڈ کے متعلق صرف الم سے بچنے کے لیے دب جاتی ہے۔11 اس لیے کہ اس کو برقرار رکھنے سے سماجی قوت اسے تکلیف پہنچا سکتی ہے۔اس لیے ایس خواہش رد کر دی جاتی ہے۔12 مگر یہ لاشعور میں باقی رہتی ہے اس ناول میں جوئی ناصر کی فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیتی ہے جبکہ ناصر کے لاشعور میں فطری خواہش پنہاں ہے اس کے برخلاف جوئی ناصر کی موت کی خبر سنتی ہے تو غیر شعوری طور پر اپنی محبت کا انکشاف کر دیتی ہے اس طرح آغا شاعر نے بالکلیہ نفسیاتی اسباب ظاہر کئے ہیں دونوں ہی خوش گوار زندگی گذارتے تھے مگر دونوں ذہنی مریض تھے کہ دونوں ایک دوسرے میں ضم ہو جانا چاہتے تھے جس کا پودہ بچپن میں ہی لگ چکا تھا۔یہی وجہ ہے کہ یونگ نے کہا ہے کہ ''ہر مرد ایک عورت کی تمنا رکھتا ہے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ لاشعور میں چھپی اس عورت کو تخیلی طور پر کسی وقت بھی جسمانی صورت دی جا سکتی ہے۔12 اس طرح ناصر نے بھی جوئی کو اپنے تصور میں بسا لیا تھا۔یہ تصویر جوئی کی طرح تھی تو دل دے دینا لازمی امر تھا جیسا کہ دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے پر جان چھڑک رہے تھے اس لیے جب ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو جذباتی ہو کر ملتے ہیں۔یونگ کا قول ہے کہ والدین اپنی اولاد کو ایسی زندگی گذارنے کی ترغیب دیتے ہیں۔جس کو وہ خود حاصل کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر پائے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت زیادہ اخلاق پر زور دینے والے ماں باپ کے بچے غیر اخلاقی حرکتوں میں منہمک ہو جاتے ہیں یا پھر اس کے برعکس ہوتا ہے۔13 مظہر کی سخت گیری نے ناصر کے کردار میں یہی بات پیدا کر دی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ ساری بندشوں اور قیود کو توڑ کر آزاد ہو جانا چاہتا ہے اور اپنی نفسیاتی حالات کے ساتھ جوئی کی یاد میں محو رہتا ہے ساتھ ہی یہاں ایک اور اہم واقعہ پیش آتا ہے کہ جوئی کی ماں ناصر کو

یہ کہکر کوستی ہے کہ جوئی کون ہے تمہاری جو اس کی حمایت کرتے ہو۔ جو ناصر کو گراں گزرتا ہے۔ اس طرح آغا شاعر نے مخلوط خاندان کے ایک اہم نفسیاتی پہلو کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ آغا شاعر نے اس ناول میں جگہ جگہ نفسیاتی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور زندگی کی حقیقت شعارانہ عکاس کی ہے جیسا کہ سہیل بخاری نے ناول ارمان کے متعلق لکھا ہے۔

''ارمان بھی ایک رومانی ناول ہے جس میں ایک خاندان کے نزاع کے المناک نتائج دکھائے گئے ہیں۔ اس ناول میں بڑی چابک دستی سے متوسط طبقہ کی خانگی معاشرت کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے جس اہتمام کے ساتھ دو معصوم دلوں میں محبت کا بیج ہویا ہے اور جس نفسیاتی انداز میں ان کی عمر کے ساتھ ساتھ اس ننھے سے پودے کو پروان چھڑھایا ہے وہ تاثیر درد اوکسک میں آپ اپنی مثال ہے اول الذکر ناول کی جملہ خوبیوں کے علاوہ اس میں آغا شاعر کی حقیقت نگاری کا بھی کمال نظر آتا ہے۔ یہ ناول اپنی معصوم رومان کی دلکش آغاز اور فطری انجام لطیف و بلیغ کتابوں نفسیاتی اشاروں حقیقی مرقع کشی۔ واقعیت نگاری ڈرامائی انداز بیان اور کرداری ارتقاء اور پر تاثیر مکالموں اعلی انشا پردازی کے باعث اردو ادب کا ایک نادر شاہکار ہے۔13

''ہیرے کی کنی''

ناول ''ہیرے کی کنی'' اردو ناول نگاری میں آغا شاعر کا وہ قیمتی سرمایہ ہے جس پر انسانی فلسفہ حیات کی بنیاد ہے۔ اس ناول کا پلاٹ ایک سولہ سالہ لڑکی کی نازیبا حرکت اور جنسی خواہشات کی لذت پر مبنی ہے اور نواب جہانگیر احمد کی نازیبا حرکات پر بھی اس ناول کی نوعیت دلکش اور دلفریب ہے۔ ناول کہ مطالعہ سے قاری کا دل و دماغ خوش رنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے متعلق آغا شاعر نے لکھا ہے کہ ہیرے کی کنی ایک ایسا ناول ہے جس میں بیسویں صدی کی حکومت ہند کے ولی عہد کی ناشائستہ حرکات اور رومانس کو دلچسپ بنا کر پیش کیا گیا ہے ناول ہیرے کی کنی انیس باب پر مبنی ہے ہر باب کا ربط و تسلسل ایک دوسرے سے یکساں اور قریب ہے۔ ساتھ ہی مفصل اور متعین نصب العین بھی اس میں کثرت سے نظر آتا ہے۔ ہیرے کی کنی میں جس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس کا نصب لعین ہندوستانی حکومت کے ولی عہد کی نازیبا حرکات غیر ذمہ دار اور ناعاقبت اندیشی ہے

جس کی آگ میں پوری ریاست جل رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ آغا شاعر کا ناول ہیرے کی کنی جس میں بیسویں صدی کے اوائل ہندوستانی روایت، رسم ورواج، حکومت سیاست کا رنگ سماجی، معاشی سیاسی تعلیمی، مذہبی اقتصادی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔اس میں آغا شاعر نے دلی کے قدیم تہذیب و معاشرت کی عکاسی کی ہے ۔ ادنیٰ اعلی کی سوسائٹی امرا'' روئسا'' کی محل سراؤں، گلی کوچو ں بازاروں کی رنگ برنگی زندگی کی مرقع کشی بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔نواب جہاں گیراور سلطانہ بیگم ناول کے مخصوص کردار ہیں جو رومان کا مرکز ہے۔دلی کی پرانی معاشرتی اور لاابالی پن فضا کا پروردہ ہے دوسری طرف دہلی کے نوابین کی مصاحبین کا نمائندہ ہے۔دوسرے نمبر کا کردار کبریٰ کا ہے۔جس کی بنیاد بے وفائی پر ہے۔مگر نواب جہانگیر دار ہوس کا شکار ہونے کی وجہ سے کبریٰ کو دل وجان سے چاہتا ہے اور پھر آخر میں کبریٰ کے بے وفائی بے حد شرمندہ ہوتا ہے اور پریشان رہنے لگتا ہے کہ سلطانہ بیگم جو کہ بچہ ایاز بن کر نواب کی خدمت میں آتی ہے وہ نواب کو صداقت پر مبنی زندگی گذارنے کی تلقین کرتی ہے اور اسے درس دیتی ہے کہ انسان کا فلسفہ حیات کیا ہے اور اس کے پیچھے خدا کی مرضی کیا ہے اس کو سمجھئے اور اسکے مطابق زندگی گذارئے دنیا تو فرضی ہے۔ابدی زندگی تو عالم برزخ ہے اس کا سامان حیار کرو اسطرح سلطانہ بیگم کو بھی اس ناول کا اہم کردار مانا جاسکتا ہے جو مختلف حرب وضرب میں ماہر ہے سچا عاشق اور باغی دوشیزہ ہے حسین صحت مند ہے۔سچائی کا ثبوت فراہم کرنا اس کا شغل ہے مجموعی طور سے ناول ''ہیرے کی کنی'' فنی اعتبار سے بڑے پایہ کی چیز ہے یہ اور بات ہے کہ اس میں رومان کا پہلو زیادہ ہے۔مگر امراؤ سے لے کر غربا تک کی زندگی کا آئینہ دار ہے جو بیسویں صدی کی ٹھاٹھ باٹھ پر محیط ہے۔یہاں ہیرے کی کنی کے پلاٹ کو مختصر طور پر قلم بند کرتا ہوں اس سے ناول کی نوعیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔پہلے باب میں ناول نگار نے ایک سولہ سالہ لڑکی حمیدن کو پیش کیا ہے جو اپنی ماں کی بنائی میٹھی ٹکیا کھا رہی ہے اور اپنے عاشق کے متعلق سوچتی ہے اور والدین کو کوستی ہے کہ یہ لوگ میری شادی نہیں کراتے۔ اس جگہ حمیدن جذبات کی حد کو پار کرگئی ہے۔آغا شاعر نفسیات کہ ماہر نظر آتے ہیں اس عالم میں لڑکی کھانے پینے سے بے بہرہ ہے وہ ہمیشہ اپنے الجھن کے بارے میں سوچتی ہے کہ کہیں ہمارے

پیار کو پڑوسی کی نظر نہ لگ جائے۔ اچھن ایک سپاہی ہے جو حمیدن کا عاشق ہے جو روزانہ چھپ کر اس سے ملتا ہے مگر حمیدن چوری کی ملاقات سے گریز کرتی ہے۔ وہ تو شادی کرنا چاہتی ہے شادی کی تکمیل نہ ہونے پر اپنے والدین کو کوستی ہے۔ نازیبا الفاظ استعمال کرتی ہے اور خواہ مخواہ احساس کم تری کا شکار ہو کر پڑوس سے نفرت کرتی ہے اس باب میں ناول نگار نے لڑکی کے جذبات کو وسعت نظر سے پیش کیا ہے۔ اس ناول میں فنی تکنیک کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جس کی مثال باب اول میں ملتی ہے۔ ساتھ ہی بیسویں صدی کے معاشرت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک سولہ سالہ لڑکی اس طرح کی بات سوچتی ہے جو اپنے جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے سب کچھ کر گذرنے کو تیار ہے۔ اس لڑکی کا باغیانہ پن ظاہر ہوتا ہے یہی آغا شاعر کی خوبی ہے کہ وہ جس عہد کی بات کرتے ہیں اس کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

اس باب میں ناول نگار نے نواب جاگیردار کے کردار کو پیش کیا ہے جو دہلی کے جلیل القدر نواب کا لڑکا ہے جس کا حسن یوسف ثانی اور عدل نوسیرواں جیسا ہے وہ شروع سے ہی کبریٰ سے عشق کرتا ہے۔ والد کی زندگی تک اظہار نہ کر سکا والد کے رخصت ہوتے ہی پہلا حکم صادر کیا وہ کبریٰ سے شادی کے متعلق تھا اس پر وزرا میں چہ مگوئیاں ہوتی ہے اس کی ماں نے اپنے خاندان کی عزت کا حوالہ دیکر سمجھایا مگر نواب نہ سمجھ سکا۔ سبھی نے عزت خاندان و وقار کا حوالہ دیا مگر بے سود لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا ملاحظہ ہو۔

گر جہ بد نا مبست نزد عاقلاں
مالے خواہم ننگ و نام را

چنانچہ شادی کی تجویز ہوتی ہے طے شدہ تاریخ سے قبل ایک بڑی رقم خزانہ عامرہ میں سے پربھو مالی کو نذر کیا جاتا ہے تا کہ اپنی برادری کے لوگوں کی آو بھگت کر سکے اس طرح جہاں گیر اور کیسری کی شادی ہو جاتی ہے۔

یہاں آغا شاعر نواب اوباشی کو بیان کرتے ہیں جو اپنے والد کے انتقال کے بعد کر رہا ہے اس وجہ سے حکومت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور مزید یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ اگر کوئی ادنی لڑکی کو اپنانا چاہے

تو اس کا کیا طریقہ تھا۔لڑکے کی طرف سے بارات نہیں جانی تھی بلکہ لڑکی کے والد اپنے ہاتھوں سے بیٹی کا ڈولا پہنچاتے تھے۔ساتھ ہی انسانی جذبات کی تحلیل نفسی بھرپور انداز سے کی ہے کہ انسان کا دل کسی پر بھی آسکتا ہے۔مقولہ مشہور ہے۔

دل نہ مانے اچھوت ذات
پیاس نہ مانے دھوبی گھاٹ

آغا شاعر نے بیسویں صدی کے نوابوں بادشاہوں کے کارناموں کو دکھلایا ہے جس سے ان لوگوں کی نجی زندگی سامنے آتی ہے۔

تیسرے باب میں ریاست بھوپال کا منظر ہے جس کے ولی عہد کو بھی کچھ اس طرح کا مزاج ورثہ میں ملا ہے وہاں محفل سجی سے رقص وسرود کا دور دورہ ہے یا یوں کہا جائے کہ عیاشی کا سامان موجود ہے بھوپالی رسم ورواج کے مطلق شاہجہاں پوری،عربی،فارسی ترکی لکھنوی وغیرہ اہم بڑے بڑے فلسفی تشریف رکھتے ہیں جہاں جہانگیر بھی مہمان خصوصی میں شامل ہے۔شاہزادہ بھوپال جلوہ افروز ہوتے ہیں لوگ خاموش ہیں ایک نوجوان موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے گرمی کو گفتگو کا موضوع بناتا ہے جس کی بنیاد فلسفہ پر ہے۔لفظ گرمی سے گفتگو کا موضوع نقطہ زبان بن جاتا ہے وہ اس طرح کہ ایک لکھنوی فرماتے ہیں''ہم سے کوئی گرم ہوکر آیا کرے گا دنیا ہمارا لوہا مانے ہوئے ہے۔

دعوی زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالاں کے سامنے

اس کے برعکس جو ایک دہلی والے تھے ان کو بڑا برا لگا فوراً فقرہ چست کیا۔

زبان لکھنؤ دہلی سے اچھی
ہماری بلی اور میاؤں ہمیں سے

اس طرح زبان کا مسئلہ ختم ہوتا ہے تو زر کا مسئلہ آتا ہے۔زر کے توسط سے برے بڑے عربی فارسی داں طرح طرح کی مثال سامنے لاتے ہیں اور زر کو دنیا کی سب سے بڑی چیز ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔تشبیہہ،استعارہ،مجاز مرسل۔یعنی علم وعروض علم بلاغت کا پورا پورا سہارا لیتا

ہے مگر اس کا انداز تجاہل عارفانہ ایک دوسریے کے ساتھ نوک جھونک یعنی بحث سے ایک دوسرے کو زیر کرنا ہوتا ہے انہیں باتوں پر تیسرے باب کا اختتام ہوتا ہے سب اپنے وطن کو کوچ کرتے ہیں

چوتھا باب جہاں گیر دار کا بھوپال سے واپسی پر لکھا گیا ہے نواب موصوف شان وشوکت سے گھوڑے کی سواری پر واپس ہو رہے ہیں۔ راستہ میں سلطانہ بیگم کا محل ہے حوا اپنے محل سے دیکھتی ہے اور سوچتی ہے کہ یہی ماہتاب ہے جس کی گود میں کیسری مالن مچلتی ہے کاش یہ مجھے نصیب ہوتا یہی لڑکی سلطانہ ناول کی کامیابی کا راز ہے اچانک گھوڑے کا رکاب ٹوٹنے سے جہاں گیر حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ آغا شاعر نے نواب کی واپسی شام چھ بجے بتلایا ہے۔ دلی والے نواب کی شان وشوکت گھوڑے کی تعریف پر کھارت کا شباب جنگل جھاڑی چرند و پرند کی آواز سرسبز پھولوں کی وادی دونو نواب کی دوستی جہانگیر کو مکمل گھوڑ سوار اور سلطانہ کی اضطراری کیفیت کو اتنا دلکش بنا کر پیش کیا ہے کہ منظر نگاری کا ہل باندھ دیا ہے۔ آغا شاعر کے اندر وہ صلاحیت موجود ہے کہ ایک جملہ کو کئی طرح سے کہہ سکتے ہیں۔ دلی کی ٹکسالی زبان پر مہارت ہے اردو تو گھر کی لونڈی تھی ہی۔

پانچویں باب میں احاطہ قلعہ معلیٰ میں نظام احمد خان یعنی سلطانہ بیگم کے چچا کا عالیشان مکان ہے۔ جہانگیر مدعو ہے سلطانہ جہانگیر اور کیسری کے بارے میں سوچتی ہے کہ ایک مالن نے کیا مقام پایا ہے اور نواب کی تعریف میں شعر کہتی ہے ۔

چشم یہ دور ہیں کس درجہ میں پیاری آنکھیں
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تمہاری آنکھیں

یہ دوشیزہ سلطانہ بیگم اپنے والدین کی لاڈلی اور اکلوتی دختر نیک اختر ہے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے اپنے چچا کے دامن عاطفت میں اپنی جائداد کے ساتھ آزادی کی زندگی بسر کر رہی ہے وہ دنیا کے ہر ہر علم وفن کی ماہر ہے، حسن مجسم، اخلاق کا پیکر دور اندیشی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ شام ہوتے ہی تقریب ختم ہو جاتی ہے سبھی محو آرام ہیں۔ سلطانہ بیگم جو نواب پر فریفتہ ہے یہ سوچ رہی ہے کہ کس طرح میر ملاقات نواب سے ہو جائے اور نواب صاحب کی جوانی کو لوٹ لیا جائے۔ مگر وضع داری کا خیال کر کے درد قلب میں مبتلا ہو کر یہ شعر پڑھتی ہے ۔

سر میرا دیوانگی سے ہے یہاں دیوار جو
واں وہ فرق ناز محو بالش کم خواب ہے

آخر سر ہانے جا کر ایک پیش بہا انگوٹھی اپنی انگلی سے اتار کر پہنا رہی تھی کہ نازک کلائی کی لوازمات سے نواب لطف اندوز ہو رہا تھا اور پھر بیدار ہو جاتا ہے۔ سلطانہ آدھی انگلی میں انگوٹھی چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے اور نواب جو کچھ دیکھا اس کا شاعر اس شعر میں ہے۔

سہ چوری بد مست آں نگارے
بد شاخ صندلیں پیچید ہمارے

چھٹے باب میں کیسری بن سنور کر اس طرح بیٹھی ہے کہ جنت کی حور دھوکہ کھا جائے اس کے حسن اور آرائش کو شعری پیکر میں یوں ڈھالا ہے۔

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ آئینے کو یاد کرتے ہیں

جہانگیر کمرہ میں داخل ہو کر کیسری سے پیار و محبت کی بات کرتے ہیں کیسری دیہاتی زبان استعمال کرتی ہے تو نواب اصلاح زبان کی تاکید کرتے ہیں اچانک کیسری کی نگاہ انگوٹھی پر پڑتی ہے وہ فریفتہ ہو جاتی ہے تو نواب انگوٹھی کیسری کی انگلی میں ڈال دیتے ہیں اور نواب آہ بھرتے آہ ملیح ہے تو صبیح ہے۔

لگاویں کیوں نہ ایسی جنس پر ہم جان شریں کو
نمک بھاتا ہے ہم کو سانولی صورت پہ مرتے ہیں

ساتویں باب میں سلطانہ بیگم مردانہ لباس میں جہاں گیر کے دربار میں غلام محمد خان کی سفارش پر نوکری کے لیے داخل ہوتی ہے۔ نواب کو آداب بجالاتی ہے۔ اپنا نام ایاز بتاتی ہے نواب ہنس کر کہتا ہے مجھے بھی اپنا تخلص محمود رکھنا ہی پڑیگا مگر نواب یہ سمجھ گیا ہے کہ یہ بچہ وہی سلطانہ بیگم ہے۔ آخر کار نواب اپنی بات ختم کر کے شب گذاری کے لیے معذرت خواہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اس وقت میری غیر حاضری کے لیے صبح تک معاف کر دو اور از راہ کرم اس غریب خانہ پر آرام فرمائیے۔

حسرت اور کنکھیوں سے اس حور کو دیکھتے ہوئے محل کو تشریف لے گئے۔

آٹھویں باب میں نواب باغ میں جلوہ افروز ہیں یہ باغ بادشاہوں کا منظور نظر شاہ جہاں آباد سے کوئی تین چار میل دور ہے۔نواب حوض کے پاس پانی سے کھیل کر لطف لے رہے ہیں۔وہاں جوگی بچہ ایاز بھی محو گفتگو ہے نواب سچائی جاننے کی کوشش کرتا ہے مگر سلطانہ ہر حال میں اپنے کو ایاز ہی متعارف کراتی ہے اور تجاہل عارفانہ انداز میں بیزار ہو کر کہتی ہے۔

فقہ رہوں یہ نہیں عادت سوال جی نواب شکر یہ ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ انداز تکلم قبل اس کے بھی میری کانوں میں گونج چکا ہے اور یہ مصرع ادا کرتا ہے۔ظالم تیری باتوں میں قیامت کا اثر ہے! نواب عالم اضطراری میں ایاز کو آغوش میں لیے کر اس کے ہونٹ کو اپنے ہونٹ سے چومتا ہے اور یہ شعر کہتا ہے ؎

تمکنت یہ بھی کہے جاتے ہیں کوہ تمکین
ناز کی یہ ہے کہ غمزے بھی اٹھائے کوئی

اس طرح نواب اپنی محبت ایاز پر آشکارا کر دیتا ہے اور کہتا ہے میں کیسری سے نفرت کرتا ہوں اور کہتا ہے کہ جہانگیر نہیں تو نہیں مگر محمود زندہ ہے اس لیے تم مجھے چھوڑ کر یا بھول کر مت جاو گے اس جملہ پر آٹھواں باب مکمل ہوتا ہے۔نویں باب میں کیسری نواب کے گھر میں قدم رکھتے ہی نواب کو اپنے جوبن سے مسحور کر کے ہر چیز پر قبضہ کر لیتی ہے نواب کو باغ عیش میں عیش مناتے ہوئے تین دن ہوتے ہیں اس دن سے کیسری نے بھی عیش ونشاط کی محفل سجا رکھی ہے۔

کیسری نے سکندر خاں کے ساتھ عشق کا چکر چلا رکھا ہے۔جہاں نواب سیر سپاٹے کو گئے ادھر کیسری بھی سکندر کے ساتھ عشق کرنے لگی ایسے موقع سے کیسری کی آوارہ گردی کو آغا شاعر کے اس شعر کے ذریعہ بیان کیا ہے ؎

ہر روزِ عید ہے ہر شب شب برات
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کر

حتی کہ دونوں شراب و کباب میں مست ہو کر بہک بہک کر باتیں کرتے ہیں اور سوسو طرح

سے اپنی جوانی ایک دوسرے پر قربان کرتے میں۔ایک دوسرے سے جدا ہونے سے خوف زدہ ہو کر یہ شعر پڑھتے ہیں۔

ہے وصل میں بھی سحر کا کھٹکا لگا ہوا
جھونکے خزاں کے آتے ہیں فصل بہار میں

اور بڑی مایوسی سے کیسری نوجوان کو دیکھتی ہے کہ نواں بات احتتام کو پہونچتا ہے اور دسواں باب ''ایاز ہے تو جہاں ہے'' کی صدا کے ساتھ نمو پذیر ہوتا ہے۔نواب صاحب ایاز کو حکم دیتے ہیں کہ کیسری کو بلائے (جب سلطانہ ایاز کے بھیس میں کیسری کو یہ خبر دیتی ہے تو دونوں میں نوک جھونک ہوتی ہے خیر کسی طرح کیسری نواب کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور اپنی شوخی سے نواب کو مجبور کر کے ایاز کو نکال دینے کی التجا کرتی ہے نواب اس پر برہم ہوتا ہے اس سے کیسری سہم جاتی ہے مندرجہ شعر پر باب ختم ہوتا ہے۔

خاکساران جہاں رابحقارت منگر
تو جہ داتی کہ درمیں گرد سوارے باشد

گیارہویں باب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ نواب جہانگیر ایاز اور وزیر نواب حبیب خاں سج دھج کر شاہانہ شان وشوکت کے ساتھ گھوڑے پر سوار شکار کو جاتے ہیں۔راستے میں ایاز اور نواب کے مابین بہت ساری باتیں ہوتی ہیں۔ایاز کیسری کی بے وفائی کا بھی ذکر کرتی ہے اس پر نواب کو بدگمانی ہوتی ہے البتہ شکار میں شیر کے خوفناک حملہ سے ایاز نواب کو بچالیتی ہے اور بہادری پر خوش ہو کر رباعی پڑھ کر داد تحسین دیتا ہے بارہویں باب کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ کیسری نے نواب کے ڈانٹنے پر رو رو کر اپنا خون کرلیا ہے۔نواب کو شکار میں گئے ہوئے تیسرا دن ہے ایک ضعیفہ نازل ہوتی ہے اور کیسری کو بتاتی ہے کہ تمہارا پردہ فاش ہوگیا ہے۔ایاز نے سارا قصہ نواب کو تمہاری بے وفائی کا بتادیا ہے جس کی خبر حبیب خاں وزیر کو بھی ہوگئی ہے تیرہویں باب میں ایک اچکا لڑکا سکندر جاہ بیگ کی انگوٹھی فروخت کرنے جاتا ہے جو نواب کی انگلی سے نکال کر کیسری نے پہن رکھی تھی اس نے سکندر جاہ کو تحفہ میں دی تھی۔بازار میں مول چند اور اس کی بیوی جئی دئی کے درمیان کافی تکرار

ہوتی ہے۔ چودھویں باب میں سکندر جاہ یعنی کیسری کا عاشق ایک ضعیفہ کو اس بات پر معمور کرتا ہے کہ ایاز جہانگیر کا قتل کر دیا جائے۔ اس لیے ضعیفہ سکندر جاہ کے پاس جاتی ہے اور وہ ساری کہانی کہہ سناتی ہے کہ کیسری کا برا حال ہے اس لیے کہ ایاز نے تم دونوں کے عشق کا پردہ نواب کے سامنے فاش کر دیا ہے سکندر جاہ ضعیفہ سے کہتا ہے کہ جاو کیسری کو تشفی دو۔ کھان کھلاؤ اور بے فکر رکھو جوگی بچہ یا نواب جہاں گیر کی اوقات ہی کیا ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں کیسری کا بال بانکا نہ ہوگا ضعیفہ کہتی ہے کہ مجھ سے کیسری نے یہ بھی کہا ہے کہ جب تک جہانگیر دار کو یا ایاز کو قتل نہ کرو گے تو میں زہر کھالوں گی۔ سکندر جاہ کہتا ہے تم جاو اور سکندر جاہ نے جہانگیر کے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔

پندرہویں باب میں جئے دئی ایک اوباش عورت ہے جو بنیا مول چند کی بیوی ہے سید خاں سپاہی یعنی حمید کا باپ جہانگیر دار کی نوکری کرتا ہے جو کیسری کا پہریدار ہے۔ رات کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہے سید خان جمعراتی دروازہ کی طرف سے آواز لگاتے ہوئے معشوقہ سے ملنے جاتا ہے وہاں جئے دئی اور سید خان میں بات چیت پیار و محبت کی ہوتی ہے۔ جئے دئی وہی انگوٹھی دکھاتی ہے جس کو اس نے مسلمان چور اچکے سے خریدا ہے واپس گھر لوٹ کر انگوٹھی اپنی بیوی کو دیتا ہے مگر اس کی بیٹی حمیدن ضد کر کے ماں سے لے لیتی ہے اور عاشق اچھن کو تحفہ میں دے دیتی ہے جو نواب جہانگیر کا سپاہی ہے۔ سولہویں باب کا آغا شام کا منظر چرند و پرند کا شور وغل کارخانوں کی آوازیں چمنی کا دھواں چھوٹے باغ کے مناظر سے شروع ہوتا ہے یہاں نواب صدیق حسن خاں صاحب کا مقبرہ ہے اس وقت اس مقبرہ کے روبرو دو سوار آپس میں باتیں کرتے جا رہے ہیں یہ نواب جہانگیر اور ایاز کی گفتگو تھی۔ اچانک سکندر جاہ موقع پا کر حملہ کرتا ہے اور پہلے ہی وار میں جہانگیر دار گھائل ہو جاتا ہے۔ نواب کا یہ حال دیکھتے ہی ایاز تاب نہیں لا سکا اپنا ریوالور نکال کر سکندر جاہ پر وار کرتا ہے جس سے اس کا بایاں ہاتھ اور گردن جسم سے الگ ہو جاتا ہے۔

اس شعر پر سولہویں باب کا اختتام ہوتا ہے ۔

جان پر کھیل کے عاشق کو بچا لیتے ہیں
تم نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

سترہویں باب میں تین دن سے پتلی گھر کے پاس ایک لاش پڑی ہے پولس والے تنقیش کر رہے ہیں مگر لاش کی شناخت نہیں کر سکے اس لیے کہ سر ہی غائب ہے جیب سے ایک کارڈ نکلتا ہے جس سے شناخت کیا گیا کہ سکندر جاہ ہے۔ آخر اس کے بوڑھے ماموں نے اس کی تجہیز و تکفین کر دی اس کے بعد خفیہ پولس والے ان کے وراثوں سے مرحوم کے متعلق پوچھ تاچھ کرتے ہیں یہ بات غلام احمد یعنی سلطانہ بیگم کے چچا کو بھی معلوم ہوئی جو کافی پریشان ہوا کیونکہ وہ ابھی ابھی وارثوں کو صبر کی تلقین کر کے آئے ہیں اور اپنے کمرہ میں گئے یہ کہکر کہ سلطانہ کو میرے پاس بھیج دو اتنے میں سلطانہ گلدستہ لیے شوخی کے ساتھ نازل ہوتی ہے اور مندرجہ ذیل شعر پڑھتی ہے ۔

گل گلدستہ کر کے آئی ہے وہ صحن باغ سے
تفریح ٹپکی پڑتی ہے ان کے دماغ سے

غرض مسکراتی ہوئی چچا کے کمرہ میں جاتی ہے دونوں چچا بھتیجی میں بات چیت ہوتی ہے اور اس حال میں واپس ہوتی ہے اپنے کمرہ میں جا کر الماری سے ڈھکا ہوا ایک خوان اور ایک سربند خواچہ نکالتی ہے اور مسٹنڈی سیاہ فلم عورتوں کو لے کر لیسری کی خدمت میں بھیجدیتی ہے۔ اور سلطانہ خوش وخرم دن گذارتی ہے اٹھارہویں باب میں نواب جہانگیر دار اپنے محل میں ہے اور ایاز کے فراق میں غمگین ہے ایاز اس وقت اس کی مصاحبت سے غائب ہو گیا جب سکندر جاہ کا قتل کر کے اس کا سر حاصل کر لیا اور نواب جہانگیر ہوش میں آیا تو وہ اکیلا تھا مگر اس کے سامنے اس کا دشمن گر کر تڑپ رہا تھا۔ نواب موصوف کو اسی وقت اندازہ ہو گیا کہ ایاز نے ہی میری جان بچائی ہے سارے درباری نواب کی مزاج پرسی کرتے ہیں جن میں اچھن بھی ہے۔ اچھن خیریت پوچھکر نبض دیکھنے لگتا ہے کہ نواب کی نگاہ انگوٹھی پر پڑ جاتی ہے اور پوچھنے لگتا ہے کہ اچھن یہ انگوٹھی تمہارے پاس کہاں سے آئی۔ یہ وہی اچھن ہے جس کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے جس پر سولہ سالہ لڑکی حمیدن قربان جاتی ہے اور شادی کے رسم ورواج سے گذر کر اچھن کے ساتھ زندگی گذارنا چاہتی ہے مگر اچھن جہانگیر دار کے یہاں ملازمت کرتا ہے جس کی وجہ سے آزاد کی زندگی گذارنا مشکل ہے۔ اچھن اور حمیدن کے تعلقات ناجائز ہیں مگر نکاح سے بے بہرہ اس طرح دیکھا جاتا ہے کہ سید خاں سپاہی سے مول

چند کی بیوی اور سید خاں کی بیٹی حمیدن اچھن سے عشق فرماتی ہیں جن لوگوں کے دل میں عشق کا دریا طلاطم خیز ہے آغا شاعر کا یہی نکتہ ان کے ناولوں میں نفسیاتی اور رومانی ناول نگاری کا سراغ دیتا ہے

انیسویں باب میں نواب صاحب وہ انگوٹھی اچھن کے ہاتھ میں دیکھکر آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور اچھن سے سوال کرتے ہیں کہ سچ بتا تو نے یہ انگوٹھی کہاں سے حاصل کی فوراً اس کو گمشدہ ایاز کا خیال آ گیا جس نے اس سے کہا تھا کہ آپ کو اپنی منکوحہ کی پاکدامنی پر کس درجہ یقین ہے۔ اب وہ سوچنے لگا کہ یہ انگوٹھی کیسری کو دی تھی اور اب یہ اچھن کے پاس ہے۔ قبل اس کے یہ بھی معلوم ہوا کہ کیسری بدچلن ہے بس کیا تھا نواب جلال میں آ گئے مگر حاضرین مجلس کا احترام کرتے ہوئے اچھن سے انگوٹھی کے بارے میں نرمی سے پوچھا اچھن نے شرماتے ہوئے کہا کہ یہ انگوٹھی میں نے سید خاں سپاہی کی بیٹی سے حاصل کی ہے اس کے بعد سید خاں کو بلایا جاتا ہے۔ دریافت کرنے پر وہ بتلاتا ہے کہ مجھے یہ انگوٹھی مول چند بنیا کی بیوی نے دی تھی یہ میری بیوی کے پاس تھی ہوسکتا ہے میری بیٹی نے ماں سے ضد کر کے لے لی ہو مگر پیر و مرشد آپ تک کیسے آئی پھر یاد آیا شاہ نے مول چند کے بارے میں معلوم کیا کہ بنیا کون ہے۔ سید خاں نے بتایا کہ مول چند ایک بنیا ہے جس کی بازار میں دکان ہے۔ نواب کے حکم سے دو سپاہی بنیا کو لے کر عالم پناہ کی خدمت میں حاضر ہوئے بنیا بتاتا ہے کہ حضور ایک مسلمان چھوکرا جو مفلس تھا بیچنے کو آیا تھا میں نے خرید لی اس کے علاوہ انگوٹھی کی بابت میں اور کچھ نہیں جانتا۔

بیسویں باب میں نواب صاحب اپنے باغ میں بیٹھا انگوٹھی کے متعلق سوچتا ہے کہ ایک انگوٹھی کی وجہ سے کیسری کی بھی جان گئی اور سکندر جاہ کی بھی وہ غمگین ہو جاتا ہے اس عالم میں ان کا ملازم اسے ایک خوشنما لفافہ پیش کرتا ہے جسے کھول کر وہ پڑھنے لگتا ہے۔ اکیسویں باب میں نواب جہانگیر دار سلطانہ کا خط مزے لے لے کر پڑھ رہے ہیں جس کا پہلا جملہ ہی اس شعر سے شروع ہوتا ہے ۔

عید آتی ہے کہ آئی ہے گھڑی ہیرے کی
کیا گلے ملتی ہے اک ایک لڑی ہیر کی

جوگی بچہ کے بچھڑ جانے سے نواب جو خودکشی پر آمادہ تھا خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور شاہانہ

جوڑے میں ملبوس غلام احمد خان کے یہاں جلوہ افروز ہوا۔ جہاں ان کا شاندار استقبال ہوا اور سلطانہ نے پس پردہ کیسری اور سکندر جاہ کی موت کا ماجرہ سنایا بس اب کیا تھا نواب جو پہلے ہی سے سلطانہ بیگم کے حسن پر ہزار جان سے فریفتہ تھا مگر اس کی جرات و دلبری اور حیرت انگیز کارنامہ دیکھ کر غلامی لکھ دینے پر آمادہ ہو گیا اور فوراً شادی کی تیاری ہوئی اور شادی ہوگئی اور بھوپال میں یہ خبر پھیل گئی کہ نواب جہانگیر دار نے سلطانہ بیگم غلام احمد ان صاحب مقصد خاص کی ایک لائق و فائق تیر دل عدیم المثال بھتیجی سے شادی کر لی اس طرح اس شعر پر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے ۔

بشر کو صبر نہیں ورنہ یہ مثال سچ ہے
کہ چپ کی داد غفور الرحیم دیتا ہے

جیسا کہ اس سے پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ ''ہیرے کی کنی'' منصف کا طبع زاد ناول ہے جو حد درجہ رومانی ہے۔ ویسے اس ناول میں صنفی طور پر بہت سے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں مگر خاص طور سے جہانگیر دار اور سلطانہ کا کردار اہم ہے اس میں سلطانہ بیگم کے کردار کو اولیت حاصل ہے۔ یہی دونوں کردار ناول کی روح ہے جو پورے ناول کے گرد طواف کرتے ہیں یہ ناول پورے اکیس باب پر مشتمل ہے ہر باب کا اختتام ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے اگر کوئی قاری چاہے کے چند باب پڑھ کر کوئی فیصلہ صادر کرے تو یہ ممکن نہیں۔ ناول ہیرے کی کنی میں آغا شاعر نے تسلسل قائم رکھنے کے لیے اپنی غیر معمولی استعداد کا استعمال کیا ہے۔ اس ناول کے تنقیدی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ حمیدن اچھن، جئی دئی، مسیت خان، نواب جہانگیر دار سکندر جاہ سب کے سب عشق کے دلدادہ ہیں جو ہمہ وقت کسی نہ کسی صورت میں عشق کی آگ میں جل رہے ہیں مگر سب کا عشق چوری چوری ہے مکمل آزاد نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم گھرانوں میں بے پردگی نہیں تھی۔ آغا شاعر نے بیسویں صدی کی رسوم کو ملحوظ رکھا ہے اور اس زمانے کی زندگی کا ہر شعبہ سمٹ کر سامنے آجاتا ہے۔ جیسا کہ دوسرے باب میں نواب جہانگیر دار شادی کے لیے تیار ہے اور اس کی ماں خاندان کی وضع داری ختم ہونے کے خوف سے منع کرتی ہے مگر نااہل بیٹے کی کرتوٹ پر مجبور ہو کر ماں کیسری کو گھر لاتی ہے۔ یہاں جذبات کو خاص دخل ہے کہ

ایک ماں بیٹے کو ہر حال میں قبول کرتی ہے۔ جہاں ذات کے مسئلے پر وزیروں میں چہ مگوئیاں ہوتی ہیں کہ ایک مسلم نواب ہندو لڑکی سے شادی کرتا ہے اس سے سیاست کا خوفناک نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ کہ غریب پربھو مالی کی زبان بند ہے اور وہ اپنی لڑکی کا ڈولا نواب کے یہاں پہنچا دیتا ہے تیسرے باب میں آغا شاعر نے امیر زادی کی مجلس ناچ گانے اور عیش کے لوازمات کو پیش کیا ہے اور بھوپال کی مجلس عاملہ کی منظر کشی چابک دستی سے کی ہے جس سے ان کی فن پر دسترس کا ثبوت ملتا ہے۔ منظر نگاری میں موصوف کو قدرت ہے چاہے کسی جگہ کی ہو اس کو پر اثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جب ہم ان کی ناول کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی منظر نگاری آنکھیوں کے سامنے ہوتی ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں منظر نگاری کر کے آغا شاعر نے منظر نگاری کے باب کا دروازہ کھول دیا ہے اور مکالمہ نگاری کے موتی پرو دیئے ہیں اس ناول کے ہ تنقیدی مطالعہ سنے اس نتیجہ پر پہونچا جا سکتا ہے کہ نواب صاحب کے گھر کیسری ایک رکھیل کے طور پر رہی ہے اس لیے ناول میں کہیں بھی کلمہ اور عقد پڑھانے کا ذکر نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ نواب صاحب کی ماں نے رسم کے مطابق کیسری کو اٹھا کر دیوان خانہ میں پہونچا دیا اس سے شادی ہونا قطعی ظاہر نہیں ہوتا ہے اس ناول میں بنیا وغیرہ کا کردار صرف ناول کو طول دیتے ہیں اور قصہ کو دلچسپ بنانے کے لیے پیش کیا ہے۔ غلام محمد خاں کا کردار صاف اور سادہ نظر آرہا ہے۔ جیسا کہ اس نے سلطانہ کو نواب کے گھر نوکری دلا کر سلطانہ بیگم کی مدد کی۔ اس ناول میں آغا شاعر نے خاص طور سے طبقہ اعلی کہ معاشقہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شرفاً کو گھر میں بھی رنڈیاں ناچتی ہیں جو اپنے آپ کو عزت دار جانتے ہیں مگر انہیں شرفا میں سلطانہ بیگم ایک مرحوم نواب کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ناول میں اس کا کردار سب سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے جس کا ذکر اس سے قبل بھی آچکا ہے۔ عزت و شرافت کے ساتھ اس کے دل میں شادی کا جذبہ موجزن ہے جس کی بدولت وہ مختلف قسم کی اذیت اٹھاتی ہے۔ ناول ''ہیرے کی کنی'' کا پورا پلاٹ اسی کے اردگرد گھومتا ہے اس کے برعکس نواب کا کردار ارتقائی ہے انہوں نے عالم شباب میں نگاہ عشق کا شکار ہو کر ایک مالن کو اپنا تو لیا مگر بعد میں بھید کھلا تو اپنے فیصلے پر کر افسوس بھی کیا اور جب عشق کا نشہ زائل ہوا تو اپنی خاندانی شرفت یاد آنے لگی اور آخر میں نواب کیسری

سے کنارہ کش ہو کر جوگی بچہ ایاز یعنی سلطانہ بیگم کی طرف رجوع ہوئے ۔آغا شاعر کچھ اس انداز سے اپنے کرداروں کو ابھارتے ہیں کہ ناول ''ہیرے کی کنی'' شروع ہوتا ہے لفظ ''میں'' سے یہ ایک کنواری لڑکی کا ''میں'' ہے اس کے شعور کی رو سے اس کا کردار اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔

''میں یہ میٹھی ٹکیا جو اماں نے بڑی چاو سے پکائی ہے، کھا تو رہی ہوں لیکن رہ رہ کر تم یاد آ رہے ہو قسم ہے نوالہ حلق سے نہیں اترتا۔ حیران ہوں کہ ان کی بیچینیوں کا ایک دن کا کیا نتیجہ نکلے گا اچھا میں کہتی ہوں کنوار پنا تو ساری دنیا کا ہوتا آیا ہے یہ خدائی مار ہمارا کنوار پنا کون ناری کا حسن چلا ہے کہ ایک گھڑی نگوری چین سے نہیں کٹتی۔ تو یہ ہے اماں باوا آپ تو چین کرتے ہیں لیکن ہمیں یوں ہی پچھتاوا کر کے بٹھا رکھا ہے کہیں کوئی بات ہی نہیں سمجھ میں آتی۔14

وہیں آغا شاعر ایک دوسری لڑکی کے کردار کو اس طرح بیان کرتے ہیں

''شاید وہ لڑکی ایسی ہی قبول صورت ہو جس پر ایک دیکھنے والے کی نگاہیں قربان ہو جاتی ہوں پھر تو تعجب نہیں ہے اگر نواب اس پر جان دیتا ہے لیکن ہائے امید میں کہتی ہوں ہر شخص تو قربان ہو جائے جوتی کی نوک سے ہو جائے نواب جہانگیر جیسا بھی تو حسن مجسم ہے خود پھر اس کی بلا کو کیا غرض پڑی تھی جو اس رذیل قوم سے آنکھیں لڑائی تو بہ ہے۔'' ح15

اس طرح آغا شاعر کا ناول ''ہیرے کی کنی'' نہایت دلفریب ہے مکالمے فطری برامحل اور برجستہ ہیں ناول میں ڈرامائی انداز نمایاں ہے۔

''ناہید''

''ناہید'' بھی آغا شاعر کا اہم ناول ہے جو دو پلاٹوں پر مشتمل ہے۔ پہلے پلاٹ میں ناہید اور جہاندار کے عاشقی کا احوال ہے اور دوسرے پلاٹ جہاندار کی خواہر اور ''ناہید'' کے بھائی منجھو صاحب کے پیار و محبت کا ذکر خیر ہے دونوں دو الگ الگ خاندان کے افراد ہیں ۔ دونوں خاندانوں میں کشمکش صدیوں سے اس دور کی روایت کے مطابق چلی آ رہی ہے ٹھیک اس طرح جس طرح ''ارمان'' میں ایک ہی خاندان کی خانگی معاشرت کی وجہ سے المناک نتائج وجود میں آتے ہیں اس کے برعکس ''ناہید'' میں دو خاندانوں کے مابین دشمنی کی چنگاری ایک مدت سے

بھڑکتی ہے وہ اچانک بہت ہی خوش آئیداور عمدہ تعلقات میں بدل جاتی ہے قصہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ناہید کے گھر آگ لگ جاتی ہے جہاندار ایسے موقع سے بغض ونفرت کو بالائے طاق رکھ کر بہادری اور دلیری سے ''ناہید'' کو بچالیتا ہے اور اس کی صحت یابی کے لیے اپنی ہمشیرہ اختر کے ساتھ زنانہ لباس ذیب تن کر کے سوسوطرح سے ناہید کی تیمارداری کرتا ہے۔ جہاندار ناہید سے محبت کا دم بھرنے لگتا ہے اور ناہید بھی اس کے لیے کمر بستہ ہو جاتی ہے۔ یعنی جہاندار اور ناہید ایک دوسرے کی محبت کے اسیر ہو جاتے ہیں جب دونوں کا راز کھلتا ہے تو ناہید کے والدین اس کو قید میں ڈال دیتے ہیں ہزار ہا پابندیاں عاید کر دی جاتی ہیں کہ جہاندار سے ملاقات نہ کرے اور نہ اس کا نام لے مگر جب جہاندار کو اس کی خبر ملتی ہے تو وہ ناہید کو اس دوزخ سے آزاد کرانے کی ترکیب سوچتا ہے۔ چونکہ جہاندار کے لیے ناہید سادہ لوح معشوقہ ہے جس کو وہ کھونا نہیں چاہتا اس سے جہاندار کو سچی محبت ہے۔ بحر حال جہاندار کی فریاد باران سے رحمت جوش میں آتی ہے اور ایک دن جہاندار ناہید کو اس کے والدین کے شکنجے سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور دونوں ہم آغوش ہو کر خوب رو رو کر جی ہلکا کرتے ہیں اور اسلامی شرع کے مطابق دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں یعنی شادی ہو جاتی ہے مگر کچھ دنوں تک دونوں کو جلا وطن رہنا پڑتا ہے ان دنوں جہاندار ناہید بنارس کانپور، اٹاوہ، آگرہ، دہلی وغیرہ کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اس حرکت کو کچھ لوگ غلط تصور کرتے ہیں مگر نہیں ایسے وقت میں ان کے لیے ایسا کرنا موزوں تھا اس لیے کہ ان دو خاندان میں نفرت ودشمنی کی آگ ایک عرصہ سے بھڑک رہی ہو وہاں معاشرے کے ذریعہ شادی ہو جائے تو یقینی بات ہے کہ تنازعہ اور بڑھے گا اس لحاظ سے جہاندانے اچھا کیا کہ شادی کے فوراً بعد ناہید کو لے کر شہر سے دور چلا گیا اور خون خرابہ سے دونوں خاندان بچ گئے اور جب دونوں کے والدین مطمئین ہو گئے تو دونوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی دوسرا پلاٹ بھی کچھ اسی طرح کا ہے کہ ادھر جہاندار کی بہن ناہید کے بھائی منجھو پر عاشق ہو جاتی ہے جہاندار اور ناہید کی بہ نسبت ان دونوں کی عاشقی دھیرے دھیرے پروان چڑھتی ہے۔ متعدد بار دونوں ملاقاتیں کرتے ہیں۔ اتنی عروج پر محبت جلی جاتی ہے گویا دو جسم ایک قالب ہوں۔ ابھی تک دونوں چوری چوری ملاقاتیں کرتے ہیں

اچانک منجھو شدید طور پر بیمار ہو جاتا ہے اس کی خبر اختر کو ہوتی ہے مگر وہ کیا کر سکتی ہے وہ تو مجبور ہے اس لیے کہ وہ لڑکی ہے اور والدین کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتی ہے پھر خاندانی شرافت بھی مانع ہے اس کے بھائی کے کارنامے سے اس کی خاندان کی شرافت پر آنچ آ چکی تھی وہ مزید اس آنچ کو بھڑ کانا نہیں چاہتی تھی آخر اس کی عقل میں بھی یہی بات آئی کہ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح مردانہ لباس میں ملبوس ہو کر اختر کی تیمارداری کو جا سکتی ہے اور وہاں پہنچ کر پہیم اختر کی تیمارداری کرتی ہے منجھو جو بیماری سے گھبرا کر زندگی سے عاجز آ چکا ہے خودکشی کے درپے ہو چکا تھا اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے منجھو نے ایک دن زہر پینا چاہا مگر اختر اپنی دوراندیشی اور حکمت سے منجھو کو زہر پینے سے باز رکھتی ہے اور منجھو کو اختر کی بے پناہ محبت کا احساس ہوتا ہے اور وہ سو سو بار ہمدردی اور محبت سے اس پر قربان جاتا ہے اور زمانے سے جو خاندانی مخاصمت چلی آ رہی تھی اس کو آن کی آن میں محبت اخوت و یکجہتی میں تبدیل کر کے نفرت کی دیوار گرا دیتا ہے اس کے بعد اختر کی شادی منجھو اور ناہید کی شادی جہاندار سے ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں بھی آغا شاعر نے ہیرے کی کنی کی طرح اعلیٰ طبقہ کی سیرت پیش کی ہیں۔ جیسا کہ ناول ناہید میں اختر منجھو کی عاشق ایک ملازم کی طرح مردانہ لباس میں تیمارداری کرتی ہے یہ مقام بالکل ایسا ہی ہے جیسا ''ہیرے کی کنی'' میں سلطانہ بیگم جوگی بچہ ایاز بن کر نواب جہانگیر احمد کی مصاحبت میں رہتی ہے ناول ناہید کا کوئی ایک کردار بھی ایسا نہیں جو دیرپا ہو یا دلچسپ ہو یہ بحث اور ہے مگر جب تنقیدی نقطہ نگاہ سے غور کیا جائے تو پہلے پلاٹ میں جہاندار اور دوسرے پلاٹ میں اختر کا کردار نمایاں اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔

آغا شاعر کا یہ ناول ان کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ دراصل یہ ناول یوپی کے تعلقہ دار خاندان کی تاریخ ہے جس میں اس عہد کی معاشرت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے اس معاشرت پر جہالت کے ساتھ ساتھ جذبات کا رنگ بہت گہرا ہے یہاں تک کہ خاندان کے افراد کے سوچنے کا طریقہ جاہلانا ہے جس میں جذبات کو خاص دخل ہے اس کی مثال ہے کہ آن کی آن میں دشمنی کی دیوار مسمار ہو کر محبت اور رفاقت میں بدل جاتی ہے ناول میں مکالمہ نگاری اور منظر نگاری خاص درجہ رکھتی ہے کسی بھی ناول کی جانچ پرکھ مجموعی طور پر کی جاتی ہے۔ ح16۔ اس اعتبار سے بھی

''ناہید'' ایک اچھا ناول ہے جس میں ابتدا سے انتہا تک قاری کی دلچسپی برقرار رہتی ہے ۔اس بات کو سہیل بخاری نے مصنف کے کمال سے تعبیر کیا ہے۔17۔اور وارن بیچ نے کہا ہے کہ ہر اچھے ساخت کا ناول اچھا نہیں ہوتا ہے۔ح۔18۔اور مام روسو کی کو اچھا ناول نگار کہہ کر خراب فنکار ٹھہراتا ہے۔ح19 ان تمام ناقدوں نے ناول کے بارے میں جو خیالات پیش کئے ہیں اس کی روشنی میں آغا شاعر کا ناول ناہید ایک ناول ہے اس میں ایک اچھے ناول کے ساتھ ناول کے سارے عناصر موجود ہیں۔عشق ومحبت تجسس، سنسنی خیزی سراغ رسانی پھر ہیرو، ہیروئین کا ملاپ جیسا کہ ناول کے موضوع سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ''ناہید'' ناول کا اہم کردار ہے جو صورت وسیرت میں کامل ہے۔ایک اچھا ناول نگار داخلی اور خارجی کائنات پر غور کرتا ہے وہ کائینات کہ مدعا کو موضوع بنا کر پیش کرتا ہے جو کہ عام انسانی زندگی کے لیے کارآمد ثابت ہو۔بیسویں صدی کے اوائل میں جہاں لاتعداد ناول نگاروں نے مروجہ روایات اور نقطہ نظر کے تحت ناول نگاری میں اپنی شناخت بنائی۔وہیں آغا شاعر دہلوی نے اپنے چار اہم ناول ارمان ہیرے کی کنی، ناہید اور نقلی تاجدار لکھے اور اردو ناول نگاری میں رومان نفسیات اور سماجیات کو شامل کیا یہ الگ بحث ہے کہ وہ دوسرے درجہ کے ناول نگار ہیں اس سے مجھے اختلاف نہیں لیکن درجہ دوم کے ادیبوں کے بغیر درجہ اول کے مصنفوں کی کوششوں کو سراہنا بھی مشکل کام ہے یوسف سرمست کا خیال ہے کہ آغا شاعر کے ناول ناہید کو اردو کے قدیم ناول نگاری میں جو مقام ملنا تھا وہ تو درکنار غور طلب بات یہ ہے کہ ناقدین اس ناول کا موہوم سا اشارہ بھی ناول پر لکھے جانے والے مضامین میں نہیں کرنے جبکہ ان کے ناول اردو ناول نگاری میں اضافہ کرتے ہیں۔آغا شاعر کے بیشتر ناولوں میں نوجوانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی کی کشمکش کو اپنے ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ناول کی شان وشوکت اس کی ہیروئن کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار سے تیار کیا گیا ہے۔ناہید کی زندگی کہ نفسیات کو قلم بند کرتے ہوئے آغا شاعر نے جدید نفسیاتی علم کا سہارا لیا اور اس کی روشنی میں اس کے کردار کی تحلیل نفسی کی ہے۔یہ ناول آغا شاعر کی ناول نگاری کی صلاحیت پر روشنی ڈالتا ہے اور بیسویں صدی کے ناول نگاری کے ان تمام رجحانات کو سامنے لاتا ہے جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔آغا شاعر کے اس ناول کے مطالعہ سے اندازہ

ہوتا ہے کہ اگر وہ پوری سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوتے تو یقیناً اردو ناول نگاری میں بہترین اضافہ کرتے پھر ان کے یہ چند ناول اردو ناول نگاری میں اہمیت رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے ناول'' ناہید'' میں ایک ایک کردار کو نمایاں کرنے میں جس تحلیل نفسی سے کام لیا ہے وہ ان کے اس ناول کو بڑی اہمیت بخشتی ہے۔جیسا کہ ناقدوں کی رائے ہے کہ ایک اچھا ناول لکھنے والا تخلیقی واقعات میں مواقع پیدا کر کے ایک بصیرت پیدا کرتا ہے۔یہی بصیرت آغا شاعر کے ناولوں میں ملتی ہے۔البتہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آغا شاعر کے ناول کے بغیر بیسویں صدی کی ناول کو سمجھنا مشکل ہوگا۔آغا شاعر نے اپنے ناول میں انسان کے نفسیاتی اور سماجی پہلو کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس سے اردو ادب کے کسی بھی نقاد کو اختلاف نہیں ہوسکتا اب یہاں تجزیہ کرنا ہے کہ کیا وہ اپنے آپ میں ایک کامل ناول نگار ہو سکتے ہیں کہ نہیں یہ ایک الگ بحث ہے۔لیکن یہ امر مسلم ہے کہ کسی بھی ناول کے لیے ایسے موضوع کا ہونا ضروری ہے کہ جو کسی بھی سماج معاشرہ اور حکومت کی صحیح تصویر پیش کر سکے جس میں ناول نگار کا مزاج، خیالات، نقطہ نظر پنہاں اور اس کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ ہر قاری یا ناقد کسی بھی تخلیقی ورثہ کو اپنے نقطۂ نگاہ سے جانچ پرکھ کر کے اس کی کامیابی کا حکم صادر کرتا ہے۔ آغا شاعر کے ناولوں میں کامیابی کے سبھی عناصر موجود ہیں اور اس بنیاد پر یہ رائے پیش کی جاسکتی ہے کہ آغا شاعر اپنے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے صف دوم کے ناول نگاروں میں اہمیت رکھتے ہیں انہوں نے اپنے ناول کے موضوعات عام انسانی زندگی سے لیے ہیں اس لیے ان میں قاری کے لیے دلچسپی بھی ہے اور تجسس بھی۔آغا شاعر نے اپنے ناولوں میں فنی اصول کا خاص خیال رکھا ہے اردو ادب کے ناقدوں اور ادیبوں کی رائے حق بہ جانب ہے کہ ایک اچھا ناول نگار ناول تخلیق کرتے وقت فنی اصول کا بہت خیال رکھتا ہے اور ہر ناول نگار فنی آہنگ کو اپنے ناولوں میں اپنے اپنے طور پر مختلف طریقے سے نبھاتے ہیں۔اس اعتبار سے آغا شاعر اپنے آپ میں مکمل ہیں لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ آغا شاعر نے اپنے ناولوں میں فن کاری کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

حوالے:

1۔ادب کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر سلام سندیلوی

2۔تنقیدی اشارے۔آل احمد سرور

3۔آج کل نئی دہلی اکتوبر 1986ء

4۔تھیوری آف لٹریچر صفحہ 101

5۔تھیوری آف لٹریچر صفحہ 251

6۔کورست ''کوارٹرلی'' اپریل، جون 1959ء

7۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 9

8۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 92

9۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 96

10۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 95

11۔کالیکٹیٹ پیپرز دولیم فورتھ صفحہ 102

12۔کانٹری بیوشن ٹو انلا سیکل سائکولوجی صفحہ 199

13۔کانٹری بیوشن ٹو انلا سیکل سائکولوجی صفحہ 191

14۔اردو ناول نگاری صفحہ 116-115

15۔ہیرے کی کنی صفحہ 1

16۔ہیرے کی کنی ''آغا شاعر صفحہ

17۔فکشن اینڈ پبلک صفحہ 213

18۔اردو ناول نگاری سہیل بخاری صفحہ 118

19۔دی ناول ان دی سینٹووی صفحہ 121

20۔گریٹ ناولسٹ اینڈ اولس صفحہ 202

جدید شاعری کے ترجمان: ناصر ملک

ہر دور کا ادب اپنے عہد کی تہذیب اور زندگی کا عکاسی ہوتا ہے اور اپنے دور کی عصری حیثیت کو پیش کرتا ہے جس کا اظہار کم وبیش زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس حقیقت کو وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو ادب برائے ادب کے قائل اور اس کا رشتہ ذہن اور زندگی سے زیادہ کتاب اور لغت سے جوڑنا چاہتے ہیں بقول ڈاکٹر محمد حسن ''انفرادی ذہن بھی بالآخر سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور وہ ادیب بھی جو اپنی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں دراصل زندگی ہی کے عکاسی ٹھہرتے ہیں۔'' ادب انسانی جمالیات اور اس کے فنی شعور وصلاحیت کا مکمل مظہر وعکاسی ہوتا ہے. انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ فنی شہہ پارے کے مطالعہ کے ذریعہ خود کو سنواریں اور اس کو قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھیں۔

کسی ملک کی تاریخ میں تہذیب سے ہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی، کس حد تک اس میں اخذ وقبول کی صلاحیت تھی اور کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی سکت یا قوت تھی۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے مختلف تہذیبی دھاروں سے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے اور ہزاروں برس کی اقوام عالم کی تاریخ میں اگر آج ہندوستان زندہ ہے تو اس کا سبب اس کے مختلف علاقوں کے تہذیبی دھارے تھے جو ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود مشترکہ عناصر بھی رکھتے تھے۔ ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ تھے مگر سب مل کر ایک رنگ تھا جسے ہندوستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی وجود میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مگر سب ایک ہاتھ کا

حصہ ہوتی ہیں۔سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتا ہے مگر بہر حال وہ ایک ہوتا ہے۔ اردو ادب ہر دور میں نشیب وفراز سے گزرتا رہا ہے۔لیکن ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اس کے لیے نت نئی راہیں ہموار کی ہیں اور ترقی کے راستے پر اسے گامزن کرتے رہے ہیں۔ ناصر ملک میں شاید ایک بات تھی کہ جس نے ان میں اوائل طالب علمی سے ہی ہر شئے کو غور سے دیکھنے پر مجبور کیا۔غور وفکر اور ذہنی ورزشیں اوائل عمری سے ہی ان کے اندر موجود تھیں۔تجسس کے جذبے نے انہیں آج اس مقام پر پہنچا دیا کہ ہندو و پاک میں ان کی شہرت اور ان کے چرچے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔اردو ادب کے کونے کھدروں میں جھانک جھانک کر ان کا مطالعہ کیا۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری زبان کا دامن جتنا وسیع ہے اس کے تمام گوشوں پر نظر ڈالنے کی صلاحیت کسی ایک طالب علم میں نہیں ہوسکتی لیکن یہ بھی یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ناصر ملک اپنا فرض پوری ایمانداری سے ادا کرنا جانتے ہیں۔اور مضامین قلم بند کرتے وقت انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔انہیں قطعی یہ دعویٰ نہیں کہان کے یہ مضامین اپنے موضوع کو پوری طرح واضح کر سکتے ہیں لیکن اگر میرے مضامین کے ذریعہ کسی اہم موضوع کی نشاندہی بھی ہو جائے تو میرے لیئے یہ بات باعث تسکین ہوگی۔ایک زمانہ تھا اردو شعر وادب کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اردو شاعری میں گل وبلبل اور لب ورخسار کی باتیں ہی قلمبند کی جاتی ہیں۔اسی طرح اردو ادب عشقیہ داستانوں پر مشتمل ہوتا تھا۔لیکن حالیہ برسوں میں اس سلسلے میں غیر معمولی تبدیلیاں آئی ہیں اور اب اردو شعر وادب میں زندگی کے سلگتے مسائل سے بھی بحث کی جارہی ہے۔اس دور کے ادب کا مطالعہ کرتے وقت ہماری جن ادیبوں اور شاعروں میں جاتی ہے ان میں ناصر ملک سرفہرست ہیں۔ناصر ملک ایک روشن خیال ادیب معروف افسانہ نگار، تاریخ داں، محقق اور میٹھے لہجے کے شاعر ہیں۔ان کا نام بہت طویل عرصہ قبل تحقیقی ادب اور شاعری کے حوالے سے سامنے آیا تھا۔انہوں نے کئی شاہکار تخلیق کئے اور اپنی نثر نگاری، ناول نگاری، شاعری اور صحافتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے لفظوں سے ایسی خوبصورت تحریروں کو ادب کا حصہ بنایا کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں میں انہیں انفرادی مقام حاصل ہوگیا۔ناصر ملک 15 اپریل 1972ء کو

چوک اعظم (ضلع لیہ) میں پیدا ہوئے۔1987ء میں میٹرک کا امتحان اعزازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ 1989ء تک گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان میں زیرِ تعلیم رہے۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد گورنمنٹ ہیلتھ ٹیکنشن کالج ڈیرہ غازیخان میں داخلہ لیا اور 1991ء میں پنجاب میڈیکل فیکلٹی ٹاپ کرتے ہوئے کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ گریجویشن اور ایم اے (اسلامیات) کرنے کے بعد سلسلہ تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ ناصر ملک کے تعلیمی سفر پر اگر ہم نظر ڈالیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی ذہین وفطین تھے اور اپنے ہم جماعت طلبا سے ہمیشہ ممتاز رہے۔ دورانِ تعلیم اُن کا شمار اچھے اور باذوق طلباء میں کیا جاتا تھا۔

اُن کے ادبی سفر کا آغاز 1985ء میں ہوا۔ بچوں کے ایک ماہنامہ میں پہلی کہانی شائع ہوئی جب وہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پھر دوسرے بڑے اور اہم رسالوں میں ان کے افسانہ شائع ہونے لگے اور یہ سلسلہ قومی اخبارات تک پھیلتا چلا گیا۔ 1986ء میں لاہور کے ایک ادبی جریدے ''آداب عرض'' نے اُن کی فنی وتخلیقی صلاحیتوں کو بے حد نکھارا۔ ابتدائی مراحل میں ہی اُن کے معاشرتی ناول ''سحر'' نے اُن کو ملکی سطح پر روشناس کرادیا اور مسلسل آج تک ناصر ملک آب تاب کے ساتھ اردو کی خدمت کررہے ہیں۔ ناصر ملک ایک ہی وقت میں اَدب کی کئی اصناف میں کام کرتے ہیں اور یقیناً اُن کو ہر صنف میں غیر معمولی دسترس بھی حاصل ہے۔ ناصر ملک کا تصنیفی سرمایہ بہت کثیر ہے۔ ان کا شمار موجودہ دور کے کثیر التصانیف ادبا میں ہوتا ہے۔ 1993ء کو اُن کی یادداشتوں پر مشتمل پہلی انگلش کتاب "Golden Memories" شائع ہوئی۔ 1993ء میں اُن کا اردو ناول ''پتھر'' کتابی صورت میں شائع ہوا۔ 1995ء میں ان کے شاعرانہ افکار پر مبنی پہلی اردو کتاب ''یہ سوچ لینا'' شائع ہوئی۔ 1996ء میں اُنہوں نے اَدبی میگزین ''شاہکار'' کا ماہ بہ ماہ اجراء کیا جو سال بھر تسلسل کے ساتھ شائع ہوا اور پھر مالی وسائل کی کمی کے باعث تعطل کا شکار ہوگیا۔ 2002ء میں اُن کی تاریخی تحقیق پر مبنی ضخیم کتاب ''انسائیکلو پیڈیا آف لیہ'' شائع ہوئی۔ 2003ء میں اُنہوں نے پنجابی اَدبی بورڈ لاہور کے لیے اپنی مادری زبان پنجابی میں ''لیہ دی تاریخ'' لکھی جو کسی وجہ سے شائع نہ ہو پائی۔ حالیہ دِنوں میں اِسی کتاب کو لہراں اَدبی

بورڈ لاہور نے شائع کیا ہے جو تاریخ کے وسیع اور دقیق میدان میں اپنی مسلمہ حیثیت رکھتی ہے۔ 2008ء میں اُن کا مجموعہ کلام ''غبارِ ہجراں'' شائع ہوا جس نے ملکی سطح پر بہت پذیرائی حاصل کی۔ اُن کے کلام کا دوسرا مجموعہ ''جان، جگنو اور جزیرہ'' منظر عام پر آ چکا ہے۔ اُن کی ایک کتاب ''لیمپ والی لڑکی'' جس میں فلورنس نائٹنگیل (جدید نرسنگ کی بانی) کی سیر حاصل بائیوگرافی دی گئی ہے۔ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

ناصر ملک کی گھریلو مالی حالت بہت بہتر نہیں رہی۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد، ملک محمد بخش، محکمہ جنگلات میں بہ طور فاریسٹر ملازم تھے۔ وہ چونکہ نہائت مذہبی اور شرعی طرزِ زندگی گزارتے تھے، اِس لیے گھر میں محض تنخواہ کی رقم ہی آیا کرتی تھی جو اتنی مضبوط ہرگز نہیں تھی کہ حلقۂ امارت میں شامل کرتی۔ ان کے بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ والد صاحب نے ملازمت کے سلسلے میں 1965ء میں سرگودھا سے نقل مکانی کی اور تھل کے دِل، چوک اعظم میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں صحرائی مناظر، خشکی، غربت اور قحط سالیوں کے علاوہ زندگی کا کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ناصر ملک یہیں پیدا ہوئے، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور پھر اَدبی سفر کا آغاز کیا۔ تصویر کشی اور سنگ تراشی کی طرف اولیں دور میں طبیعت مائل رہی۔ اِس دوران انہوں نے بچوں کیلیے بھی کچھ لکھا اور بعد میں لاہور کے ماہناموں میں افسانے بھیجنا شروع کر دیے۔ شائع بھی ہوتے رہے، حوصلہ افزائی ہوتی رہی اور ان کا شوق بڑھتا رہا۔ بعد میں تحقیق کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ ناصر ملک نے کبھی بھی شعر اور تاریخ کو کہانی پر ترجیح نہیں دی بلکہ ہر تحریر کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ شاعر پہلے تھے، افسانہ نگار اور تحقیق نگار بعد میں۔ وہاں چونکہ شعر و ادب کا ماحول نہیں تھا اور اِس ہنر میں کمال کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا، اُن دِنوں یہاں کے اَدبی حلقوں تحقیق و فلسفہ میں ڈاکٹر خیال امروہوی کا نام گونجتا تھا۔ وہ اُن مقتدر ہستیوں سے اَدبی استفادہ حاصل نہیں کر پائے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر خیال امروہوی اور ظفر اقبال ظفر جیسے معتبر اور معروف شاعروں کی صحبت اور رہ نمائی حاصل ہوئی تو ان کے ہنر میں پختگی آ گئی۔

ناصر ملک نے شعر و ادب کے ذریعہ ہی اردو کی خدمت نہیں کی بلکہ اردو زبان کے تحفظ و بقا کے

لیے بھی سرگرداں رہے۔اردو کے سلسلے میں ان کے افکار ونظریات بہت واضح ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ اردو ادب کے بارے میں لوگ بے طرح مایوسی کا شکار ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دَم توڑ رہا ہے مگر انہیں ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی۔اردو کے مستقبل سے قطعی مایوس نہیں ہے لیکن اردو اکادمیوں اور اداروں کی سرگرمیوں اور ان کے فلاح وبقا پر خرچ کئے جانے والے کثیر رقم سے مثبت نتائج برآمد ہونے کی امید کرتے ہیں۔ان کا یقین ہے کہ وہ پاکستان میں فعال ادیبوں کی عدم سرکاری توجہ کے باوجود کی جانے والی کوششوں سے مطمئن ہوں اور ان کو یقین ہے کہ آنے والا کوئی قریبی عہد اُردو زبان اور اردو اَدب کا ہوگا۔پوری دنیا میں اردو کی صورت حال پر نظر رکھتے ہوئے بطور خاص پاکسانی ادب سے امیدیں وابستہ کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اِس وقت ملک کے اندر لسانیت،صوبائیت اور فرقہ واریت کی آگ کا جلاؤ بھڑک رہا ہے۔وطنِ عزیز اور ہماری قوم ایسی ریشہ دوانیوں اور بدعنوانیوں کی متحمل نہیں ہے۔دُشمن کی چالاکیاں،سازشیں اور خطرناک چالیں ہماری معاشرتی زندگی کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہیں۔اس سنگین صورتِ حال کا مقابلہ صرف ادیب ہی کرسکتا ہے کیونکہ ملک کا ہر باشندہ اَدیب پر اعتماد کرتا ہے۔اُس کے لکھے ہوئے کو معتبر خیال کرتے ہوئے راہنمائی طلب کرتا ہے۔ان کا خیال ہے کہ شاعر وادیب اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرے کو ایک مثبت سمت کی طرف لے جاسکتا ہے۔اخوت ومحبت بھی ادیب ہی پیدا کرسکتا ہے۔ویسے بھی ہر ایسے دور میں پاکستانی ادیبوں نے جاندارنہ کردار ادا کیا ہے خواہ اُنہیں کتنی بڑی قیمت ہی ادا کیوں نہ کرنا پڑی ہو۔وہ ادب کے ذریعہ حکومتی سطح پر پھیلی بے ضابطگیوں کو اجاگر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ 1947ء سے شروع ہونے والا سفر ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔حکومتی کارندوں کی بے ضابطگیوں کی طرف انگلی اٹھانے کے ساتھ انسانیت کے اخلاقی زوال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ان کے اشعار میں تہذیبی زوال کی پریشانیاں بھی ہیں اور ایک صحت مند معاشرہ کی تشکیل کی آرزو بھی۔بحیثیت ایک حساس شاعر کے انہوں نے زندگی اور اس کی محرومیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔حکمراں طبقہ سے مصالحت یا سستی شہرت یا مقبولیت کو اخلاقی قدروں کے خلاف تصور کرتے ہیں۔

مصلحت نے جھکا دیا اس کو
ٹوٹ جاتا تو آج اس کا تھا

☆

تجھ کو تو بازوؤں پہ بہت ناز تھا مگر
دستار گر پڑی ہے تری خودکشی کے بعد
دھبے ردائے پاک پہ اتنے لگے کہ آج
دھرتی لرز اُٹھی تِری بخیہ گری کے بعد
غربت گھروں کے چولھے چراغوں کو کھا گئی
ہر آنکھ بجھ گئی ہے تری روشنی کے بعد
رہبر ! زمانِ غار ، یہ روشن خیالیاں
یہ قوم مرگئی ہے تری بُزدلی کے بعد

ہم ہر آنے والی حکومت پر انگشت اُٹھاتے ہیں اور اسے اپنے لیے خدائی عذاب قرار دیتے ہیں مگر کبھی بھی ہم نے یہ سوچنے کی ہمت نہیں کی کہ ہم کونسی فصل بیج رہے ہیں۔ جو شخص جتنے وسائل رکھتا ہے اتنی ہی بے ایمانی کرنے کا سوچتا رہتا ہے۔ کوئی بھی شخص تعمیر کا جذبہ نہیں رکھتا بلکہ ہر کوئی اینٹ اکھاڑنے کے چکر میں ہے۔ ایسے میں کوئی بھی حکومت کیا کر سکتی ہے۔ حکومت عوام کے چنے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور جیسے لوگ ہوں گے ویسی ہی حکومت ان کے گلے پڑے گی۔ معاشرے میں ہر سطح پر بے ضابطگیاں، بے ایمانیاں اور بے قاعدگیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ قانون اور آئین تک محفوظ نہیں۔ آخری طبقے کا فرد بھی قانون توڑنے اور بائی پاس کرنے کے خیالات رکھتا ہے تو ایسے میں کسی بھی حکومت سے ہم یہ توقع کِس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ اللہ دین کا چراغ رگڑ کر ملکی حالات سنوار دے گی۔

ناصر ملک نے اردو کے علاوہ دوسری زبانوں مثلاً میں بھی انگریزی، اردو اور پنجابی زبانوں میں بھی لکھا لیکن ان کا کثیر اور اہم سرمایہ اردو میں ہی ہے۔ وہ زندگی کے حقیقتوں اور مصائب زمانہ

کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ ایک پرامید فضا پیدا کرنے چاہتے ہیں جس میں انسان اور انسانیت کا احترام ہو۔

ناصر ملک کی نمایاں کی خصوصیت ان کے موضوعات ہیں وہ عشق و پیان کی زبان میں دل کے لطیف جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کو سماج کے اس طبقہ کے ہمدردی ہے۔ جو سامراجیت کے شکار ہیں۔ جن کے ہاتھ میں سخت مشقت کی وجہ سے چھالے پڑ گئے ہیں لیکن آج بھی ان کی محنت کی عوض مناسب مزدوری نہیں ملتی۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پھر مفلسوں نے رکھ دیے اُن کے سروں پہ تاج
جن رہبروں کا اُن سے کوئی واسطہ نہیں
اے زمیں! دوزخ کدہ ہے تُو غریبوں کیلیے
خون سے تُو رہبروں کو پالتی ہے کس لیے
لہو کی روشنائی سے مرے قاتل نے لکھا تھا
رہِ مقتل سجا دو ، اِک مسیحا ڈھونڈ لایا ہوں
مفلس ہیں، فاقہ کش جو یہاں بدنصیب لوگ
لائیں گے انقلاب وہی عن قریب لوگ
ملت کا خون چوسنے والے امیر تھے
کوٹھی لگے ہیں آج مگر ہم غریب لوگ

مفلس زادوں کو لقمے بھی خون کے بدلے ملتے ہیں
ایسا حاکم کیوں دھرتی نے اپنے رَب سے مانگا تھا
بانجھ کتابوں کی قبریں تو شہر میں ہر سُو پھیلی تھیں
لیکن حرف کو ہم نے گونگے کھیت میں اُگتے دیکھا تھا
کاغذ چننے والے ننھے ہاتھ میں چھالا دیکھا تو

میرے پہلو میں دل ناصر کتنی زور سے دھڑکا تھا

مِرے نصیب پہ روتا ہے آج کیوں منصف
مجاز تھا کہ وہ مجھ کو معاف کر دیتا
اَنا جواز کو کیسے قبول کر لیتی
مجھے شعور ہی اُس کے خلاف کر دیتا

لوگ قیدی ہو گئے ہیں گھر بنا کے شوق میں
بے گھروں کے سامنے دُنیا پڑی ہے آج بھی
پھر سراجِ عہد و پیماں نے جلائے ہیں نقوش
تالیوں کے شور میں وہ رو پڑی ہے آج بھی
رہ گئیں محنت کشوں کے ہاتھ میں کچھ ٹہنیاں
جیت تاجر کی ہوئی ، سارا ثمر اُس کا ہوا
ایک نقطے میں سمٹ کے رہ گئی ہے زندگی
ایک پل میں طے جوانی کا سفر اُس کا ہوا

بخت بے احتیاج اُس کا تھا
کھیت میرا ، اَناج اُس کا تھا
وقت نے کی عجب مسیحائی
درد میرا ، علاج اُس کا تھا

ناصر ملک کی زندگی کی سچائیوں ،نشیب وفراز ،آرزوؤں اور زندگی کی تمام حقیقتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مثلاً

وہ گلی میں رُک گیا تھا آج میرے رو بہ رُو
اُس کی باتوں میں گھلی تھی اُس کے لہجے کی تھکن
ہو گیا تھا رقصِ تشنہ کام سے وہ مضمحل
چشم تر میں بھیگتی تھی ہر ستارے کی تھکن
صعوبتوں کا جہاں ہے جہانِ حرف وادب
رہینِ شوق ذرا تیز گام کر لینا

میرا آغاز میری موت کے ڈر پر رکھا
گویا آلام کا سایہ میرے گھر پر رکھا
تند حَربوں کے بپھرنے کی خبر آئی ہے
تاج قدرت نے اَنا کا میرے سر پر رکھا
عہد کے آغاز میں بہتا رہا آدم کا لہُو
دہر کے انجام کو بھی خوف و خطر پر رکھا
تُو نے اپنایا نہیں مجھ کو وگرنہ میں نے
اپنا ہر سجدہ ہمیشہ تیرے دَر پر رکھا
تقسیم کسی اور کے ہاتھوں سے ہوئی، پھر بھی
الزام میرے شہر کے لوگوں نے شجر پر رکھا
منزل کا تعین بھی بڑی بات ہے ناصر
فیصلہ قدرت نے مگر زادِ سفر پر رکھا

ناصر کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نیچر کے الفاظ کے ذریعہ اپنی شاعری کی تعمیر کرتے ہیں۔مثلاً ان الفاظ کے ذریعہ نخل ،دار،سفر،مقتل،ملک،زمین،اس طرح کے الفاظ کے ذریعہ اپنے خیالات کو شعری پیکر میں ڈالتے ہیں۔

وہ مے خانہ نہیں دشتِ جنوں کا اِک سمندر تھا
جہاں سے جگنوؤں کا میں جزیرا ڈھونڈ لایا ہوں
محبت سے کبھی اُس نے مری جانب نہیں دیکھا
کہ اَب نخلِ فلک سے میں ستارا ڈھونڈ لایا ہوں

ان کی نظموں کے عناوین بھی منفرد ہیں مثلاً ''بہار، بادل، بجلی''، ''بت، برکھا اور بے ثمر'' وغیرہ ہیں۔ وہ اسی دنیا کی اشیا سے اپنی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں اور ماورائی دنیا سے الگ نئے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہجرت ایک ایسا المیہ رہا ہے جس نے انسانیت کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ناصر ملک کی اس مسئلے کو پیش کرتے ہیں۔ آج زمانہ میں کتنی بھی ترقی کیوں نہ کر لی ہو آمد و رفت کتنا ہی آسان سے آسان تر کیوں نہ ہو گیا ہے برقی ذرائع سے دوریاں کیوں نہ مٹا دی گئی ہو لیکن آج بھی روٹی کپڑا اور مکان اس تعلیم بھی شامل کر لینا چاہئے کے مسائل جوں کہ توں ہیں اور ایک مہاجر اس کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ناصر ملک نے انہیں کی ترجمانی کی ہے۔

ہے پڑاؤ رائیگاں ناصر تمہارا شہر میں
ہجرتوں کے دور میں یہ بھی نگر اُس کا ہوا
مجھ کو میرے شہر میں بدنام کرنے کے لیے
آ گیا ہے میرا گھر نیلام کرنے کے لیے
اَب ضروری ہو گیا ہے میرا تجھ کو چھوڑنا
زندگی میں اور بھی ہیں کام کرنے کے لیے

ہجرت میں ریاضت کی تھکن میرے لیے تھی
ریت میری تھی مگر رنگِ صدف اُس کے لیے تھا
اُسے ہجرت کا شوق کتنا تھا

اپنا گھر تک جلا دیا اُس نے

ناصر ملک کی شاعری میں تغزل کا خوبصورت انداز ملتا ہے۔

ایک سورج آ گیا تھا آئینے کے روبرو
زلف کو کھلنا پڑا تھا کام کرنے کے لیے

آج ، اِسی لمحے، اِسی وقت، یہیں سے ہو
عشق آغاز تو ہو، چاہے نہیں سے ہو
برسوں اِس آس پہ جاگیں میری پُرنم آنکھیں
سامنا وَید کا مجھ خاک نشیں سے ہو
کوئی روزہ نہ دُعائیں نہ عبادت درکار
عشق کافی ہے مگر پختہ یقیں سے ہو
منصف لیے پھرتے ہیں تماشائی آنکھیں
ظلم پھر کیسے عیاں اُس کی جبیں سے ہو
یوں تو ظلمت کے ستاروں سے کئی اُترے ہیں
کسی راہ بَر کا تعلق تو زمیں سے ہو
آؤ اِس ریت پہ ہم خیمے لگائیں ناصر
چشمِ جاناں بَرملا یہ کہہ گئی ہے دوستو!
پیار کی دولت نہیں ہے عام کرنے کے لیے
حیرت سے دیکھتا ہے پلٹ کر مِرا جنوں
یہ کس نے اُس کو چوم لیا اور مر گیا
وہ شخص باخبر تو ہے میرے ملال سے
آنے کا اُس کے پاس مگر راستہ نہیں

اُس کو جانے کی جلدی تھی ورنہ میں بھی
آخر اِک دن اُس کے دل کو بھا سکتا تھا
میرا فن بھی ایک جدائی مانگ رہا تھا
ورنہ جانے والا واپس آ سکتا تھا
میں ہنر میں طاق تھا یا اُس کا پیکر موم تھا
میرے ہاتھوں میں کھلا تو میرے جیسا ہو گیا

کیا خبر تھی اِس طرح رستہ جُدا ہو جائے گا
وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے خفا ہو جائے گا
دھڑکنوں سے آج کیسی پھوٹتی ہے یہ صدا
دل بڑا ویران ہے ، کیا حادثہ ہو جائے گا

رہینِ بخیہ گر تو ہے مگر ملحوظ خاطر ہو
مِری دستار کو تم نے کبھی ململ نہیں کہنا
محبت اضطرابِ زندگی کے ساتھ پلتی ہے
سکونِ دل کو ناصرؔ مسئلے کا حل نہیں کہنا

ناصر ملک کی شاعری میں تاریخ اسلامی سے خوبصورت تر اور معنی خیز تلمیحات ہی بھی ملتی ہیں۔

لہو نے روک رکھی ہیں یزیدِ وقت کی راہیں
زمانہ کس طرح روکے مجھے خیمے لگانے سے
کھٹکتا ہوں میں فرعونِ جہاں کی سرخ آنکھوں میں
مگر ٹلتا نہیں پھر بھی غریبوں کو جگانے سے

ناصر ملک کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جن کی شاعری زندگی کے ہمہ جہت مسائل آرزوؤں، امنگیں اور احساس وجذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ موجودہ دور میں وہ ایک عظیم شاعر وفنکار کی حیثیت سے ہماری اردو کی میراث کا حصہ ہے اور مسلسل اردو شعر وادب کی خدمت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ عالمی ادب کے اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے پر ان کی شاعری کو پرکھیں تو وہ اس میں کھڑی اتریں گی۔ وہ دن دور نہیں جب گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے نصاب میں ان کی شاعری مطالعہ میں رکھی جائے گی۔

ناصر ملک کی شعر فہمی: 'ہتھیلی' کی روشنی میں

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے باتیں کر کے یا پھر جن کا ذکر خیر سن کر روحانی مسرت اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ایسی شخصیت اہل تصوف کے یہاں پیر و مرشد کی ہوسکتی ہے۔اہل اسلام بالخصوص اہل علم کے نزدیک عالم باعمل کی ہوسکتی ہے۔یا پھر کوئی بھی شخص جسے اپنا آئیڈل تصور کر لیتا ہے۔اسے قلب ونظر میں یہ مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔لیکن ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں جو مذکورہ بالا میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی دلوں پر حکمرانی کرتی ہیں جن سے کمپیوٹر کے ذریعہ آن لائن اور فون پر گفتگو کر کے مسرت اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔جن کی تصویر دیکھ کر احترام وعقیدت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جن کا ذکر خیر باعث اطمینان قلب ہوتا ہے۔دراصل ایسے اشخاص انتہائی بلند کردار اور اعلیٰ درجہ کے انسانی بالخصوص، اسلامی اخلاقیات کے حامل ہوتے ہیں۔حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کو پورے شعور کے ساتھ نہ صرف فریضہ تصور کرتے ہیں بلکہ ہر وقت اسے عملی طور پر انجام دینے میں پس وپیش سے کام نہیں لیتے۔ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر ادبی اور انسانی خدمت کرتے ہیں۔میری نظر میں ایسی بہت کم شخصیات میں سے ایک ناصر ملک بھی ہیں جو اپنے مرتبہ ومقام علمی حیثیت جذبۂ انسانی خدمت منسکر المزاجی، مہمان نوازی، ایثار وقربانی اور اردو واہل اردو سے بے لوث محبت کی وجہ سے وہ بڑی قدآور شخصیت کے مالک ہیں۔جسے عام قد وقامت والوں کے درمیان ناصر ملک صاحب کی شعری اور نثری تخلیقات میں سے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو آن لائن بھی ان کے ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔مجھے اعتراف ہے کہ موصوف کی جملہ کتابوں کے مطالعہ کا موقع فراہم ہوا ہے۔میں نے ان کے آن لائن میگزین اردو سخن کے دیباچے اور دیگر ادبی

تقریبات میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے علمی موضوعات پر پیش کی گئی تقاریر کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک مستند علمی شخصیت اور معتبر ادیب ہیں۔ان کا مشاہدہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ناصر ملک صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے قابل تقلید ہے۔اہل پاکستان بالخصوص اردو کے لیے موصوف کی اس ارض بہشت میں یعنی مراد ان کی آبائی وطن سے ہے۔

ہتھیلی جو کہ ناصر ملک کا شعری مجموعہ ہے اس میں حمد ونعت،غزلیں،نظمیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں۔ناصر ملک نے اس مجموعہ میں تمام شعری وفنی تقاضوں کو برتتے ہوئے مختلف موضوعات مثلاً انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی اور قومی ملی کے مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔بعض نظموں میں زندگی کے تلخ تجربات کو بیان کیا ہے۔یا اس شعری مجموعہ کے ذریعہ بالخصوص مجموعے کے آخر میں پنجاب وسندھ میں 2010 میں آئے سیلاب میں ہونے والی تباہی وبربادی سے متعلق تخلیقات پیش کی ہیں۔ناصر ملک کا شعری سفر اس مجموعہ میں پختہ اور حساس نظر آتا ہے۔ان کا انداز ہ پیش کش ،موضوعات اور مسائل زندگی کے مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

مہندی سے اِک خواہش اپنے ہاتھوں پر
سکھیاں لکھ کر چوری چوری پڑھتی ہیں

زندگی میں امید اور ناامیدی کی کیفیت ان کی شاعری کا حصہ ہے۔وہ زندگی سے مثبت نتائج اخذ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔لیکن ان کی نظر موجودہ دور کے نظام حیات پر گہری ہے۔ان کی امیدیں جہاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں وہیں وہ پرامید بھی نظر آتے ہیں۔

چراغِ شب جلا کہیں ؟ نہیں ،نہیں ، ابھی نہیں
سحر نے ڈھونڈ لی زمیں ؟ نہیں ،نہیں ، ابھی نہیں

ان کی شاعری میں کلاسیکی موضوعات کی رنگا رنگی بھی خوب نظر آتی ہے۔مقتل ،جگنو،چشم جیسے الفاظ سے تغزل کا انداز پیدا کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔مثلاً

چشمِ تر میں نقوش لرزاں ہیں
غم یہاں بے لباس ہے میرا

جگنوؤں کو اُجال رکھا ہے
اس کا ملنا قیاس ہے میرا
ہیں بدن پر حقوق مقتل کے
دل مگر اُس کے پاس ہے میرا

جہاں ایک طرف قدیم روایتوں کے پاسداری ہے وہیں فرسودہ نظام سے بغاوت واحتجاج بھی موجود ہے۔عمل کے مقابلہ جتنے بھی بے عملی و پر مبنی خیالات کا رواج ہے وہ اس پر ضرب لگاتے ہیں۔ہتھیلی کو استعارہ بنا کر زندگی کے مختلف جہات کی اشارہ کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

لکیروں کو مٹا بھی دو، لکیریں مار دیتی ہیں
ہتھیلی کاٹ پھینکو ناں، ہتھیلی مار دیتی ہے
اے لڑکی! اِس ہتھیلی سے بغاوت ہو نہیں سکتی
اگر یہ رُوٹھ جائے تو محبت ہو نہیں سکتی
یہی تو لمس دیتی ہے شروعاتِ تعلق کو
سمندر ہے، سمندر سے عداوت ہو نہیں سکتی
ہتھیلی کی لکیروں میں چھپے ہیں اوس کے موتی
مگر بے فیض ہاتھوں سے کرامت ہو نہیں سکتی
سنو! اپنی شرارت یا ہتھیلی مار دیتی ہے
ہتھیلی سے نہ اُلجھو یہ ہتھیلی مار دیتی ہے

زندگی کے تگ ودوہ میں انسان آج بھی زمانہ سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے۔آج بھی اسے سخت محنت ومشقت کے عوض دو وقت کی خوراک میسر نہیں ہوتی۔کہنے کو زمانہ نے تو بہت ترقی کر لی ہے اور زیست کو آسان سے آسان تر بنانے میں انسان نے نئے نئے آلات خلق کر لیے ہیں اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کر لی ہیں۔لیکن ایک عام شخص کیا ان وسائل سے فیضیاب ہو پاتا ہے جواب نفی میں ملے گا۔ناصر ملک اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ان کی نظر سماجی وسائل کی طرف گہری ہے۔مثلاً

یہ اور بات قافلے سرعت سے چل دیے
وہ شخص راہِ زیست میں اَب بھی کھڑا تو تھا
پلتا ہے غریبوں کی کمائی پہ جو بدبخت
رہزن ہے حقیقت میں وہ مخدوم نہیں ہے

جب بھی تشدد یا مذہبی منافرت نفرت کے عوض بے گناہوں کی جانیں جاتی ہیں اور برسہا برس انصاف کے لیے گجرات کے اندر ذکیہ جعفری جیسے در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ناصر ملک کا دل کرب سے تڑپ اٹھتا ہے۔

ساٹھ برسوں بعد بھی بوڑھی زبانوں پر ملے
حرص کے مارے ہوئے بلوائیوں کے تذکرے

جب بھی ظلم و جبر نے سر اٹھایا ہے تو ادیبوں اور قلم کاروں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ آواز بلند کرنے کے نتیجہ میں حکمراء طبقہ نے ادیبوں اور شاعروں کو زدوکوب بھی کیا۔ فیض اور حبیب جالب جیسے شاعروں کو جیلوں میں ڈالا گیا اور کبھی جعفر زٹلی کی طرف شہید بھی کیا گیا ۔لیکن ناصر ملک نے اپنا فرض نبھاتے ہوئے اس مسئلہ کی طرف اپنی شاعری میں اشارہ کیا ہیتا کہ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو حق گوئی کا حق حاصل ہو سکے۔

کبھی اِس جرم کی پاداش میں ایسا ہوا بھی ہے
کہ شاعر یا کہانی کار مقتل میں کھڑا ہو اور
اسے اتنی اجازت بھی نہ ہو کہ گفت گو کر لے
گھڑی بھر دیکھ لے اُس کو، جسے اُس نے تراشا ہو
جسے ترتیب بخشی ہو، جسے برسوں تلاشا ہو
مجھے منظور ہو گا تم کوئی بھی فیصلہ لکھ دو
میں اپنے ہر ہنر میں بھی اُسے ترتیب دیتا تھا

وادیٔ سوات میں خواتین پر ہو رہے ظلم و جبر کے خلاف اپنی آوازیوں بلند کرتے ہیں۔

(وادی سوات کی ہجرت کے تناظر میں)

ہمارا حوصلہ انصار کا سا تھا مگر اُس کو
ہمارے ناتواں دل سے اسی قصرِ امارت کے
لہو آلود جبڑوں نے اچانک نوچ ڈالا ہے
ہمیں معلوم ہے کل کو ہمارے گھر میں بھی ایسی
ہزاروں میّتوں پہ روٹیوں کے بین گونجیں گے

ناصر ملک کی شاعری میں ہجرت کے کرب کا احساس موجود ہے۔ آبائی وطن سے رخصت ہونے کے بعد سفر کی صعوبتیں اور نئی منزل کی تلاش وجستجو اور اجنبیت کے احساس کی تڑپ کو انہوں نے جذباتی انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

چار کمروں کی جنت کہانی ہوئی
میرے پُرکھوں کی محنت کہانی ہوئی
فصل اُجڑی، شجر، پھول، پودے گئے
ایک پل میں مویشی بھی اوجھل ہوئے
میری املاک کے سب نشاں مٹ گئے
سارے منظر اچانک بیگانے ہوئے
گھر کا رستہ بھی مجھ کو دکھائی نہ دے
کیا کروں آج کچھ بھی سجھائی نہ دے
میری بیٹھک نہ ڈیرہ ، نہ مسجد یہاں
دادی اماں نہ دادا کا مرقد یہاں
اب نہ بہنیں ، نہ بھابھی ، نہ بھائی یہاں
کیوں یہ قسمت مجھے لے کے آئی یہاں
میرا گھر ، میری دُنیا ٹھکانے لگی

زندگی کس طرف لے کے جانے لگی
نام درکار ہے اِس کڑے درد کو
زندگی چاہیے آخری فرد کو

ماں کی عظمت اور اس کی تقدس پر اشعار کہتے ہیں۔

چارہ گر ! بس مجھے سائباں چاہیے
چند لقمے نہیں لختِ جاں چاہیے
گھر کے سامان کا تذکرہ مت کرو
اور کچھ بھی نہیں، مجھ کو ماں چاہیے

ماں اس کائنات میں زندگی کا سرچشمہ ہے۔اس کا سایہ ہی کسی بھی شخص کی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب میں اپنے وطن کو ماں کا درجہ دیا گیا ہے۔ناصر ملک زندگی دینے والے اور زندگی کی حفاظت اور پرورش کرنے والے دونوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی عظمت کے قائل ہیں۔کسی بھی آفت،مصیبت، یا پریشانی میں انسانوں کی مدد کرنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔پنجاب میں آنے والے سیلاب میں رضا کاروں کے لیے کہی گئی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ

وہ جو موت کی آنکھ میں آنکھ ڈالے
وہ پانی میں پھنسے ہوؤں کو نکالے
وہ معدوم ہوتی ہوئی چیخ سن کر
اجل کے شکنجے سے بیٹی چھڑا لے
کہیں مامتا کو تڑپتا نہ چھوڑے
کہیں باپ کی زندگی کو بچا لے
وہ ساگر میں پیاسوں کو پانی پلائے
وہ بھوکوں کو کھانا کھلا کر دعا لے

خبر دے وہ بیمار کو زندگی کی
وہ تن ڈھانپ کر آخرت بھی کما لے
وہ صدیق ثانی بنے ، گھر لٹا دے
وہ انصار بن کر مہاجر سنبھالے
وہ دریا سے ، پتھر سے ، آفت سے لڑ کر
کسی ایک ہی زندگی کو بچا لے

رضا کاروں کو جنہوں نے اپنے جانوں پر کھیل کر آفت آسمانی کی چنگل سے چھڑانے کے لیے خود اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالتے ہیں۔

بیٹے کے ہاتھ سے نیا بستہ پھسل گیا
بیٹی کا تھا جہیز جو دریا نگل گیا

سیلاب سے ہوئی بربادی وتباہی کا ذکر بہت ہی جذباتی انداز میں کیا ہے۔ یہاں ان کا رنگ کربلائی مرثیے سے جاملتا ہے۔ وہیں کرب وہ اندوہ جو کہ تاریخ اسلام کا حصہ ہے۔ ناصر ملک اس حادثہ میں محسوس کرتے ہیں جس میں سیلاب نے ہزاروں بے گناہوں کو نگل لیا تھا۔ ناصر ملک اپنی شاعری میں ایک پختہ کار شاعر کے حیثیت سے موجودہ دور کے صف اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کیشاعری کی مطالعہ سے بحسن وخوبی کیا جاسکتا ہے ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

یہ کس مقام پر ہمیں خدا نے لا کھڑا کیا
کوئی بتائے تو سہی کہ جرم ہم نے کیا کیا
یہ دھوپ کتنی تیز ہے ، کھلا ہے سر پہ آسماں
یہ بھوک بھی بلا رہی ہے ایک مرگِ ناگہاں
نگل گئی ہے پیاس میرے نونہال سینکڑوں
یہ آگ چاٹ کر چلی ہے باکمال سینکڑوں

جنہیں بچا رکھا تھا میلی آنکھ سے، وہ بیٹیاں
اَب عالمِ بے پردگی کی نذر ہو گئیں یہاں
یہ سیلِ بے ثمر ہمیں بھکاریوں کے روپ میں
کھڑا کیے ہے محوِ رقص دل شگاف دھوپ میں
سیاستِ وطن کا فیض ، بہہ گئے غریب گھر
وہ دشمنانِ قوم کی بچی رہی زمیں مگر
ہماری بے کسی کے اشتہار کس قدر بکے
مذاکروں کے نام پر کھلے ہیں اور ئے کدے
ہمارے نام پر برس رہی ہیں زر کی بارشیں
سجی ہوئی ہے منظروں سے ہر دکان دیکھ لیں
غریب کا معاوضہ حکومتوں کا مال ہے
فریب ہے ، یہ مقتدر کی بھوک کا سوال ہے
مرے خدا ! وطن کی سرزمین مجھ پہ تنگ ہے
مری طرف اُٹھی ہوئی نگاہ سرخ رنگ ہے

مذکورہ نظم میں خدا سے شکواہ کے انداز میں قومی بیضاعتی کا ذکر کرتے ہوئے فریاد کناں ہیں کہ خدا کی آفت سے کب نجات ملے گی۔ جب بھی کوئی آفت اور مصیبت آتی ہے تو غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ جبکہ حکمرا طبقہ کے لوگ اظہار افسوس کے بجائے اس لیے خوشیاں مناتے ہیں کہ امداد کی رقم کو کس طرح اپنی ذاتی تصرف میں لیا جائے۔ وہ اس کی ترکیبیں کرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان ہو یا پاکستان یا بنگلہ دیش ہر جگہ کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ شاعر وادیب کی ذمہ داری بھی سرحدوں کو نہیں دیکھتی۔ بلکہ جب بھی انسانیت کا خون ہوتا ہے ایک سچا اور حساس شاعر اس کرکو ذاتی کرب کی طرح محسوس کرتا ہے۔ ناصر ملک کا شمار انہیں شعراء میں کیا جا سکتا ہے۔

میرے مہمان ! بہتر پتا ہے تجھے

ہم ازل سے کڑی آفتوں میں رہے
خون، جنگ و جدل، زلزلے، آگ بھی
حکمرانوں کے ناوقت کے راگ بھی
آمریت نے توڑا ہمیں بارہا
عہدِ جمہور بھی خون پیتا رہا
ٹیکس کے عوض میں لوڈ شیڈنگ ملی
قحط و بحران کی آگ جلتی رہی
ملک دو لخت ہو کر سسکتا رہا
بینک بیلنس وزیروں کا بڑھتا رہا
اک سپاہی کا ڈنڈا ہی قانون ہے
سلطنت بھی وڈیروں کی مرہون ہے
لاکھ بھونچال ہوں ، لاکھ سیلاب ہوں
رہزنوں کے خزانے تو سیراب ہوں
میرے مہمان ! یوں دل نہ میلا کرو
چند لقمے مرے پاس ہیں ، بانٹ لو
میں نہ ممبر ، وڈیرا ، نہ سردار ہوں
ہاں مگر میں ہی تیرا الم خوار ہوں
ہم غریبوں میں گر یہ جہالت نہ ہو
ان لٹیروں کی ہم پر حکومت نہ ہو

سیلاب کے باوجود امراؤ کے خزانے بھرتے ہی جا رہے ہیں ۔جہاں ایک طرف انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے وہیں دوسری طرف ذخیرہ اندوزی میں بڑے بڑے لوگ مصروف ہیں۔اس پر شدید طنز کیا گیا ہے۔ناصر ملک کی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ

بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں انسانیت سے ہمدردی اور ظلم سے نفرت و بغاوت ہے۔ وہ اپنی بات بے باکی سے کہہ دیتے ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب بھی سماجی وملی یا قومی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں ان کا شعری آہنگ کبھی متاثر نہیں ہوتا اور یہ ہنر ایک عظیم شاعر وفنکار کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہاں سے ان کی شاعری سے متعلق خصوصیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے جبکہ وہ اپنی ہمہ جہت خصوصیات کی وجہ سے عالمی پیمانہ پر شہرت کے حامل ہیں۔ چونکہ وہ ابھی بھی ایک فعال ادیب ودانشور کے حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پوری اردو دنیا میں تمام برقی مجلّہ واخبارات سے متعلق صحافیوں کی اپنے برقی مجلّے کے ذریعہ رہنمائی فرمارہے ہیں۔ موجودہ دور میں ایک مردمومن کا یہی جہاد ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی قارئین کو اپنی تحریروں افکاروخیالات سے سرفراز کرتے رہیں گے۔

کتابیات

کتابیات

1- آغا شاعر حیات وشاعری	مرتبہ مجتبیٰ حسین خاں	لاہور	1970ء
2-اردو ناط کی تاریخ	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی لکھنؤ	لکھنؤ	1962ء
3-انگریزی عہد میں ہندوستان	عبداللہ یوسف علی	الہ آبادی	1936ء
4-اردو ادب میں رومانی تحریک	ڈاکٹر محمد حسن	لکھنؤ	1950ء
5-اردو ادب جنگ عظیم کے بعد	ڈاکٹر سید عبداللہ	لاہور	1941ء
6-ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	لکھنؤ	1986ء
7-اردو ناول نگاری	سہیل بخاری	دہلوی	1972ء
8-اردو نثر کی داستانیں	گیان چند جین	کراچی	1945ء
9-اردو زبان اور فنی داستان گوئی	کلیم الدین احمد	پٹنہ	
10-اردو کا افسانوی ادب	بہار اردو اکیڈمی	پٹنہ	1987ء
11-اردو ناول سمت ورافتار	سید حیدر علی	الہ آباد	1977ء
12-ارمان	آغا شاعر قزلباش	دہلی	1903ء
13-امراؤ جان ادا	مرزا ہادی رسوا	دہلی	1958ء
14-ایام عرب	عبدالحلیم سرر	لکھنؤ	1915ء
15-ایامی	ڈپٹی نظیر احمد	دہلی	1991ء
16-ابن الوقت۔	مرتبہ سید ڈپٹی نظیر احمد	لاہور	1961ء
17-بہار کا اردو ادب	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی	1986ء
18-بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست	حیدر آباد	1973ء
19-پریم چند شخصیت اور کارنامے	پروفیسر قمر رئیس	دہلی	1987ء
20-ترقی پسند ادب بچاس سالہ سفر	پروفیسر قمر رئیس	دہلی	1987ء
21- تنقیدی اشارہ	آل احمد سرور	علی گڑھ	1942ء

22-ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	علی گڑھ	1945ء
23-خمکدہ خیلم	کتب پرنٹرز اینڈ پبلیسرز لیمیٹڈ	کراچی	1976ء
24-خدائی فوجدار	رتن ناتھ سرشار	لکھنؤ	1903ء
25-داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	لاہور	1960ء
26-ذات شریف	مرزا ہادی رسوا	لکھنؤ	1921ء
27-اوبائے صادق	ڈپٹی نذیر احمد	دہلی	1899ء
28-سرشار کی ناول نگاری	ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب	کراچی	1961ء
29-سونیئر	آغا شاعر میموریل سوسائٹی	دہلی	1983ء
30-صبح گلشن	مطبوعہ شاہ جہانی	بھوپال	12-15 ہجری
31-عبدالحلیم شرر سحمہ یتاروفن	ڈاکٹر شریف احمد	دہلی	1989ء
32-عجائبالقصص تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی	1987ء
33-فسانہ آزاد	رتن ناتھ سرشار	لکھنؤ	1935ء
34-مقدمہ شعروشاعری	الطاف حسین حالی	لاہور	1945ء
35-میدان عمل	منشی چند	دہلی	1952ء
36-مراتہ العروس	ڈپٹی نذیر احمد	کانپور	1886ء
37-محمد علی طیب حیات اور تعانیت	ڈاکٹر عبدالحی	دہلی	1989ء
38-ناہید	آغا قزلباش	دہلی	1903ء
39-ہندوستان کا اردو ادب	ڈاکٹر محمد ذاکر	دہلی	1981ء
40-ہیرے کی کنی	آغا شاعر قزلباش	دہلی	1903ء
41-پریم چند کا تنقیدی مطالعہ	قمر رئیس	دہلی	
42-قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی	
43-انتظار حسین ایک دبستان	ڈاکٹر ارتضیٰ کریم	دہلی	

''رسائل''

''چمنستان''	1940-41-46ء	دہلی
''نقد ونظر''	1942ء	آگرہ
''منادی''	1942ء	دہلی
''سیپ''	1964ء	کراچی
''آج کل''	1947-84ء	دہلی
''انجام''	1964ء	کراچی
''شعلہ وشبنم''	1952ء	دہلی
''گوشت''	کوارٹرلی1959ء	بمبئی

BIBILOGRAPHY OF ENGLISH BOOK

1. Aspect lf the Novel - E.M. Forster - 1962 - London.

2. The Art of Novel- Pelhan Edgar - 1933 - New York

3. The Advance of the English Novel-W Lyon Philips1916NY

4. The Living Novel - Pritchett - 1954 - London

5. Munshi Prem Chanda - Madan Gopal - 1964, Delhi

6. Modern Novel - Walter Allem - 1964 - New York

7.Collection Papers Vol-IV- Sigmond Frend-1948 London

8. Contribution to Analytical Psychology - C.G. Jung,

Trasnlated by H.G. and Carry F. Baynes

9. The Novel in the Twelth Century-Joseph Warren-1932 NY

10. Theory fo Literature - Warren

11. Piction and reading Public

12. Great Novelist and their Novel's

13. Novelist on the Novel - Ed Miriam Allett - 1954- London

14. The Novel Today - Philip Hinderson - 1936- London

15. The Rise of the Novel - I am watt - 1957- London

16. Reading a Novel - Walter Allen -1956- London

17. The English Novel - I.B. Priestly - 1905 London

18. The Novel and the people - Rolf Fox -1956 - Moscow

19.The story of a Novel - - Thoms Wolf - 1936 - New York

20.The technique of the Novel-Thomars H.Uzzel.1947 U.S.A

Adabi Shakhsiyaat

Dr. Md. Yahya Saba

Published By:

MAAZ PUBLICATIONS

H.No.117, S. No.170, Zaitoon Pura,
Malegaon Nasik, Maharashtra, India, 423203

9 788193 047736